اس کے مروجہ مختلف نسخوں کا ذکر ہے،

موطا امام محمد مترجم اُردو، مترجمہ خواجہ عبد الوحید صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۵۴۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد سے ر، پتہ: محمد سعید اینڈ سنز، ناشران و تاجران کتب، قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی،

حدیث کی کتابوں میں موطا امام مالک کا درجہ محتاج بیان نہیں، اس کے بھی بہت سے رواۃ ہیں، ان میں دو راویوں کی موطا زیادہ مشہور ہے، ایک یحیی بن یحیی اللیثی اندلسی کی روایت کردہ، دوسری امام محمد شیبانی کی جو عرف عام میں موطا امام مالک کہلاتی ہے، اور دوسری موطا امام محمد، ان دونوں میں موطا امام محمد بھی اسکی بعض خصوصیات کی بنا پر امتیاز حاصل ہے، موطا امام محمد کا ترجمہ اردو میں ہو چکا ہے، مگر وہ پرانے طرز کا ہے، اسلیے خواجہ عبد الوحید صاحب نے مع اصل کے ترجمہ کیا ہے، اور جا بجا فوائد کے عنوان سے تشریح طلب امور کی شرح بھی کر دی ہے، کتاب کے شروع میں مولانا عبد الرشید صاحب کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، جس میں موطا امام مالک اور موطا امام محمد کا مفصل تعارف اور ان کی خصوصیات وغیرہ کا ذکر ہے، یہ مقدمہ زیادہ تر موطا امام محمد پر مولانا عبد الحیٔی مرحوم فرنگی محلی کے مبسوط عربی مقدمہ سے ماخوذ ہے،

قصص النبیین جزء ثالث، جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۳۸ صفحات، خوبصورت ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھپی ہے، قیمت تحریر نہیں، مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملیگی۔

فاضل مولف نے عربی مدارس کے طلبہ کیلیے انبیاء علیہم السلام کے قرآنی قصص پر عربی ریڈروں کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اسکا تیسرا حصہ ہے، اسمیں حضرت موسیٰ کا قصہ ہے اور بنی اسرائیل کے قیام مصر کے زمانہ سے حضرت موسیٰ کی وفات تک بنی اسرائیل کو جو واقعات پیش آئے، انکو جن جن حالات سے گذرنا پڑا اور پیہم انعامات الٰہی کے بعد انکی سرکشی کی سزا میں انکا جو انجام ہوا، انکو قرآنی آیات کی روشنی میں بڑے موثر اور سبق آموز انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس طرح اس کتاب کے ذریعہ عربی زبان کیساتھ مذہب و اخلاق کی بھی تعلیم ہو جاتی ہے، اور طلبہ کو قرآن مجید سے بھی مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، کتاب کی خوبی کے لیے مصنف کا نام نامی پوری ضمانت ہے،

"م"

جلد ۷۹، ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۵۷ء نمبر ۴

فہرست مضامین

شذرات

ابھی چند سال ہوئے مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے ماتحت ادارۂ علوم و فنون اسلامی کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم ہوا ہے جس کا مقصد اسلامیات پر تحقیقات ہے، اس مرتبہ اس کے لائق عہدہ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب کے ساتھ اس کو دیکھنے کا موقع ملا، ادارہ کے متعلق ایک کتبخانہ ہے، گو ابھی مختصر ہے لیکن اسلامیات کی تحقیقات سے متعلق عربی اور فارسی کی اہم اور ضروری کتابیں موجود ہیں اور ان میں اضافہ کا سلسلہ برابر جاری ہے، ان میں بعض نئی مطبوعات اور پرانی کتابوں کے نئے عمدہ اڈیشن ایسے نظر آئے جو ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتے، ان کو ڈاکٹر صاحب مصر، ٹرکی اور ایران کے سفر سے ساتھ لائے تھے، کئی ریسرچ اسکالر اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کا کام کر رہے ہیں، ابھی یہ ادارہ ابتدائی منزل میں ہے، اگر اس سے پورا کام لیا گیا تو امید ہے کہ آیندہ چل کر ایک مفید اور اہم ادارہ بنجائے گا،

اس سلسلہ میں وقت کی ایک اہم ضرورت کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا جسکا احساس اور لوگوں کو بھی ہے، ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال سے ہندو مسلمانوں کا ساتھ ہے، اسکے باوجود ایک محدود طبقہ کے علاوہ من حیث القوم دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے مذہب، انکے تصورِ حیات، نظامِ زندگی اور علوم و فنون کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی جس سے آجتک انکے متعلق غلط فہمیاں ہیں، گو ہر زمانہ میں مسلمانوں میں ایسے اہل علم موجود رہے ہیں جنکو اس ضرورت کا احساس تھا، اور انھوں نے اس فرض کو انجام بھی دیا، چنانچہ قدیم علماء و مصنفین میں ابو معشر فلکی، ابو ریحان بیرونی، امیر خسرو، فیضی اور غلام علی آزاد وغیرہ نے ہندوؤں کے مذاہب اور علوم و فنون کی بڑی خدمت کی اور انکے متعلق عربی اور فارسی میں معلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا، اس دور کے علماء میں مولانا شبلی مرحوم، سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس ضرورت کی طرف توجہ کی، اور اس پر مضامین لکھے خصوصاً مولانا

سید سلیمان ندوی نے تو عرب و ہند کے تعلقات جیسی ضخیم اور فاضلانہ کتاب لکھدی جو ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے، اور جس میں اس قسم کے بہت سے مسائل آگئے ہیں، ہندوؤں میں صرف ڈاکٹر تارا چند کا نام قابل ذکر ہے،

مگر اب تک جسقدر کام ہوا ہے وہ ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ہے، اسلیے ہند و مسلمان اہل علم و قلم اور انکے علمی اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مذہب، علوم اور تہذیب کے متعلق ایسا مستند اور تحقیقی لٹریچر مہیا کریں جس سے ان کی صحیح شکل نظر آئے خصوصاً مسلمانوں کو مذہب اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو ان کی اصلی شکل اور ہندوستان میں ان کے مذہبی اور تمدنی اثرات کو پوری تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے، اور اگر ہو سکے تو ہندی میں، اس سے ان چیزوں کے متعلق غلط فہمیاں بھی دور ہونگی اور انکی عظمت بھی لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگی، یہ کام مذہبی و علمی اور قومی و سیاسی ہر حیثیت سے ضروری ہے، دار المصنفین کے آیندہ کاموں میں بھی انشاء اللہ اسکا لحاظ رہیگا اور توقع ہے کہ ادارۂ علوم و فنون اسلامی بھی اسکو پیش نظر رکھیگا،

مسلمانوں کی دینی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہمیشہ سے دلی اور صوبہ متحدہ رہا ہے، عربی کے تمام بڑے بڑے دار العلوم یہیں ہیں، مگر مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں یعنی موجودہ مغربی و مشرقی پاکستان میں بھی ہر زمانہ میں مذہبی تعلیم کا بڑا چرچا رہا ہے، اور اب بھی یہاں عربی کے بکثرت مدارس ہیں، انگریزی حکومت نے بھی یہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا لحاظ کر کے، ان صوبوں میں عربی و دینی تعلیم کی سرپرستی کی، اور اس کی اشاعت کے مختلف ذرائع اختیار کیے تھے، چنانچہ یہاں عربی کے سرکاری و نیم سرکاری مدارس اور ان کے امتحانات کا پورا انتظام قائم ہے، کلکتہ اور ڈھاکہ میں مدرسہ عالیہ اور لاہور میں اورینٹل کالج عربی تعلیم کے بڑے مرکز ہیں، ڈھاکہ یونیورسٹی میں دینیات کا مستقل شعبہ قائم ہے، ان سرکاری تعلیمگاہوں کے علاوہ قومی مدارس کی بہت بڑی تعداد ہے، خصوصاً مغربی پاکستان میں متعدد ایسے مدارس ہیں جو دار العلوم کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر یہ سب پرانے طرز کے ہیں، اور ان میں کوئی ربط و نظام نہیں ہے، اسلیے انکا فائدہ محدود ہے،

پاکستان کے قیام کے بعد قدرۃً وہاں عربی اور دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ گئی ہے، اگر ان مدارس کی اصلاح اور تنظیم ہو جائے تو ان سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے، اس ضرورت کے پیش نظر

حافظ نذر احمد صاحب لیکچرار علوم اسلامی اسلامیہ کالج لاہور نے پاکستان کے دونوں حصوں کے مدارس کا جائزہ لیکر اس کی روداد شائع کی ہے، اور ہمارے پاس بھی اس کو اظہار رائے کے لیے بھیجا ہے، اس جائزہ میں پاکستان کے عربی مدارس کی تعداد، انکی جائے وقوع، ان کے نصاب اور طلبہ کی تعداد کا پورا نقشہ دیا ہے، اگرچہ یہ جائزہ مکمل نہیں ہے، پھر بھی اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں میں عربی مدارس کی اتنی بڑی تعداد ہے کہ انکی اگر اصلاح و تنظیم ہو جائے تو ان سے بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور یہ کام پاکستان کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے اور اس میں امداد کرنا حکومت کا بھی فرض ہے۔

عربی مدارس درحقیقت دین کی حفاظت کے قلعے ہیں، اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو ہندستان اور پاکستان دونوں سے مذہب رخصت ہو چکا ہوتا، اور آج اس کی جو مدہم روشنی بھی باقی ہے وہ ان ہی مدارس کا فیض ہے، مگر حالات کے تغیر کے ساتھ دینی تعلیم کے نصاب، اسکے طریقۂ تعلیم میں اصلاح، اور جدید ضروریات کا بھی لحاظ ضروری ہے، اس کے بغیر اس زمانہ میں دین کی صحیح خدمت نہیں ہو سکتی، اور نہ جدید تعلیم کی چکا چوند کے سامنے عربی مدارس کا چراغ جل سکتا ہے، خصوصاً پاکستان کے عربی مدارس اور عربی تعلیم کی اصلاح نہایت ضروری ہے، ورنہ وہاں مغربیت اور بے دینی کا جو سیلاب آیا ہے، وہ مذہب اور اسلامی تہذیب اور روایات سب کو بہالے جائے گا،

معارف پریس میں ابتک باہر کا کام نہیں لیا جاتا تھا، مگر اب ایک نئی مشین کا اضافہ ہو گیا ہے جب سے باہر کے کاموں کی بھی گنجایش نکل آئی ہے، جو صاحب ذوق حسن و نفاست اور صحت کے ساتھ اپنی کتابیں یا اشتہار وغیرہ چھپوانا چاہیں وہ معارف پریس میں چھپوا سکتے ہیں،

معارف میں بھی دارالمصنفین کی کتابوں کے علاوہ اور کسی قسم کا اشتہار شائع نہیں کیا جاتا تھا، مگر اس کا خسارہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس اصول کو مجبوراً توڑنا پڑا، اور آیندہ سے اس میں سنجیدہ اشتہار شائع کیے جائیں گے، مشتہرین کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

مقالات

مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ

(نقوش و تاثرات)

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم، اے

(۲)

مولانا کی زندگی علمی کاموں سے معمور رہی، لیکن ہنگامے کے کاموں سے بالکل پاک رہی، ان کی داستان حیات بس اتنی ہے کہ پڑھتے رہے، پڑھاتے رہے، لکھتے رہے، لکھاتے رہے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن گیلانی میں پائی، وہاں سے ٹونک گئے، جہاں مولانا برکات احمد ٹونکی کے حلقۂ درس میں نو سال تک رہے، پھر دیوبند گئے، اور مولانا محمود حسنؒ، علامہ انور کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا اصغر حسینؒ سے فیضیاب ہوئے، طالب علمی ہی کے زمانہ میں دیوبند کی مجلس شوریٰ میں طلبہ کی طرف سے نمایندہ منتخب ہوئے، جو اس زمانہ میں بڑا اعزاز تھا، دارالعلوم کے ماہوار رسالوں القاسم اور الرشید کی ادارت ان کے سپرد ہوئی جس کے معاوضہ میں تیس روپے ماہانہ مقرر ہوئے، جب ان کے مضامین القاسم میں شائع ہوئے تو اکبر الٰہ آبادی نے ان کو بہت حوصلہ افزا خطوط لکھے، دیوبند سے آکر کچھ دنوں مونگیر میں ندوۃ العلماء کے بانی مولانا محمد علی رحمۃ اللہ کی خانقاہ میں بھی رہے، ان کا خود بیان ہے کہ یہاں کی "خانقاہی زندگی میں ندوۃ العلمائی رنگ جاری و ساری تھا، جس کا اثر ان پر بھی پڑا، حضرت سید صاحبؒ ان کے متعلق فرماتے کہ وہ کبھی

ندوی نہیں، وہ بھی ندوی ہیں، یعنی تعلیم کے لحاظ سے تو ندوی نہیں لیکن اپنے فطری ذوق کی بناپر ندوی ہیں، مونگیر میں مولانا محمد علیؒ نے ان کو تبلیغی کاموں میں لگایا، وہ چونکہ شروع ہی سے اچھے واعظ اور مقرر تھے، اس لیے اس کام کو اچھی طرح انجام دیا، مولانا محمد علیؒ کے خاندان سے ان کا رشتہ بھی ہوگیا تھا، ان کی ایک بہن مولانا محمد علیؒ کے بڑے صاحبزادے مولانا لطف اللہ مرحوم سے منسوب تھیں،

کچھ دنوں کے بعد وہ مونگیر سے پھر دیوبند بلالیے گئے، اور پچاس روپے ماہانہ پر القاسم کی ادارت پر مامور ہوئے، اسی زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار انڈین ڈیلی نیوز نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی، تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہنچی جس میں مولانا مناظر احسن بھی تھے، ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں آئی کہ شاتم رسول اور اس کے ہم مذہبوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیدیا، کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار اسٹیٹسمین نے ایک افتتاحیہ لکھکر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا، اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں، مولانا کے دوستوں اور ہموطنوں نے ان کو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا، اور وہ زبردستی بمبئی اور مدراس کے راستے سے دیوبند روانہ کردیے گئے، مگر راستے میں عید کا چاند دیکھکر حیدرآباد اتر پڑے، وہاں مولانا حمید الدین فراہیؒ سے ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی، مولانا حمید الدین نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا، وہ دیوبند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، لیکن خود دیوبند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیوبند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہوگا، اس لیے انھوں نے درخواست دیدی، ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہوسکا، اس درمیان میں وہ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے درس لیتے رہے، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اس زمانہ میں حیدرآباد کے صدر الصدور تھے، اور وہاں کے

کی دینی وعلمی سرگرمیوں کا مرکز تھے، اسی لیے مولانا فراہیؒ مولانا گیلانیؒ کو ان کے پاس لے گئے، اور یہ کہا "ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں"، شروانی صاحب نے فرمایا "یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی"۔ مولانا گیلانی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "ان کے لطف وکرم کی موسلا دھار بارش کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کردیا"، عثمانیہ یونیورسٹی میں تقرر سے پہلے حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مولانا علیل ہوگئے، اور مستقل کھانسی اور بخار رہنے لگا، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ان کو اپنے ساتھ علی گڈھ لے گئے، اور وہاں علاج کرایا، اس کے بعد وہ اپنے وطن گیلانی چلے گئے، یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا، اور وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں شعبۂ دینیات کے استاد مقرر ہوگئے، اور سنہ ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، پانچ سو پنشن ملی، لیکن اس گرانقدر تنخواہ اور پنشن کے باوجود اپنی پرانی سادگی کسی حال میں نہیں چھوڑی، حیدرآباد کے قیام میں زیادہ تر ایک مسجد کے حجرہ میں رہے،

جب بوڑھے ہوکر ریٹائر ہوئے اور گیلانی میں آکر قیام کیا تو ان کا قلم اور بھی جوان ہوگیا، اور آخر تک وہ علمی کام کرتے رہے، وہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی سے بہت متاثر تھے، اور ان کے کارناموں کو تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں،

"سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لیے ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہے کہ علم میں وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگوں کے لیے بسا اوقات ان کی باتیں نقصان رساں ہو جاتی ہیں، لیکن یہ ان کے کلام کا نہیں بلکہ پڑھنے والوں کا نقصان ہے"

ان میں یہ تمام شرائط موجود تھے، اس لیے شیخ اکبر کو ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا،

لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے ان کا قلم مختلف سمتوں میں چلتا رہا، اور مختلف قسم کے مضامین کے ساتھ ساتھ ان کا قلم مولانا محمد قاسمؒ بانی دار العلوم دیوبند کے سوانح پر چل پڑا تو ایک ہزار صفحے لکھ کر رکا، جب اس کا مسودہ دیوبند پہنچا تو وہاں کے اہل علم نے اس کو تین جلدوں میں تقسیم کیا، دو جلدیں تو چھپ گئی ہیں، ایک جلد ابھی باقی ہے،

وہ دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے، پنشن کے بعد مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے، مارچ سنہ ۱۹۵۰ء میں دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ ہوا، اس میں شرکت کے لیے وہ گیلانی سے اعظم گڈھ تشریف لائے، میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے میرے ہی قیام گاہ میں قیام فرمایا، اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ جناب ڈاکٹر سید محمود (جو اس وقت بہار میں وزیر ترقیات تھے) مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا محمد عمران خاں مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے تھے، جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لیے اسٹیشن گئے، تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک چادر، ایک تکیہ، المونیم کا ایک لوٹا، اور ایک کپڑے میں لپیٹے ہوئے ایک دو جوڑے کپڑے تھے، خود ان کی ذات بھی نمود و نمایش کی آلایشوں سے پاک تھی، یہ دار المصنفین میں ان کی پہلی تشریف آوری تھی، اس لیے یہاں کے ایک ایک فرد سے بڑی گرمجوشی اور محبت سے ملے،

ان بزرگوں کی آمد سے دو تین دن تک دار المصنفین میں بڑی چہل پہل رہی، دار المصنفین کے لوگوں کے علاوہ شہر کے معززین کا بھی اجتماع رہتا، لیکن ہر محفل میں مولانا ہی بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے تھے، مذہبی، علمی، تاریخی، سیاسی جو موضوع بھی زیر بحث ہوتا، مولانا اپنی طباعی اور ذہانت سے کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ پیدا کر دیتے کہ حاضرین ان ہی کی طرف مائل ہو جاتے، ان کی گفتگو میں ایسی رنگین سنجیدگی اور متین شوخی ہوتی کہ پوری مجلس زعفران زار

بن جاتی، اور ان قہقہوں میں بھی لوگ یہ محسوس کرتے کہ ان پر حکمت و دانش کی بارش ہو رہی ہے،

سقوط حیدر آباد کا ذکر آیا، تو فرمایا کہ ایک روز قاسم رضوی اپنے رضاروں کے دستہ کے ساتھ ان کے مکان کے احاطے میں چلے آئے، اور دیر تک فوجی قواعد کرتے رہے، اسی احاطہ میں مسجد بھی تھی لیکن جب مغرب کی اذان ہوئی تو قاسم رضوی کے سوا ان مجاہدوں میں سے کسی نے بھی خانۂ خدا میں آنے کی زحمت گوارا نہیں کی، نماز کے بعد مولانا نے قاسم رضوی سے فرمایا کہ تمھارے مجاہدوں کی قوت ایمانی تو آج دیکھ لی تمھاری جو فوجی و حربی قوت ہے اس کا حال تم کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے، پھر ایک بڑی طاقت کے خلاف کس برتے پر لڑنے چلے ہو، قاسم رضوی نے کہا جیتا ہوں، چلاتا ہوں، شاید کارگر ہو جائے، مولانا نے یہ واقعہ بیان کر کے فرمایا "یہ کتنی بڑی نادانی تھی"۔

اسی قیام میں جماعت اسلامی کے ایک پرجوش کارکن نے ان کو اپنی جماعت کا مخالف سمجھ کر ان سے مناظرانہ رنگ میں بحث شروع کر دی لیکن مولانا کی صلح پسند، درشادان و فرحاں طبیعت میں کسی کی دل آزاری کی گنجایش ہی نہیں تھی، اس لیے بحث کرنے کے بجائے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا کہ بھائی، یہ بتاؤ کہ مولانا مودودی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سگے بیٹے ہیں، اور ہم سب ان کے سوتیلے بیٹے ہیں کہ وراثت میں مولانا مودودی ہی تنہا اسلام کو صحیح سمجھنے کا حق رکھتے ہیں، اور ہم کو کوئی حق نہیں، مولانا کے کہنے کے انداز میں کچھ ایسی دل آویزی تھی کہ اسی پر بحث قہقہوں میں گونج کر ختم ہو گئی،

ایک دوسرے موقع پر کسی سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ بہار شریف میں ایک عربی مدرسہ ہے، وہاں کے طلبہ کو ایک مدرس سے شکایت تھی کہ وہ اچھا نہیں پڑھاتے، میں ایک بار عثمانیہ یونیورسٹی کی چھٹیوں میں حیدر آباد سے اس قصبہ میں پہنچا تو مدرسہ کے متولی صاحب نے

اصرار کیا کہ میں اس مدرسہ میں ایک سبق پڑھادوں، میں نے ان کی خواہش کی تعمیل کردی، درس سے طلبہ بہت خوش اور مطمئن ہوئے، متولی صاحب نے مدرس سے مخاطب ہوکر کہا کہ "آپ بھی ایسا ہی کیوں نہیں پڑھاتے"، مدرس نے جزبز ہوکر کہا "مولانا بارہ سو پاتے ہیں، پلاؤ قورمہ کھاکر پڑھاتے ہیں، جیسا کھاتے ہیں، ویسا پڑھاتے ہیں، میں تیس روپئے پاتا ہوں، دال بھات کھاتا ہوں، جیسا کھاتا ہوں ویسا پڑھاتا ہوں" یہ جواب سن کر متولی صاحب خاموش ہوگئے، مولانا جب یہ واقعہ سنارہے تھے، تو جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف فرما تھے جو اس وقت حکومت بہار کے وزیر تھے، اور پہلے وزیر تعلیم بھی رہ چکے تھے، مولانا نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ ملک میں زیادہ تر دال روٹی پر گذارہ کرنے والے ہی تعلیمی اور علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں،

اور پھر اسی سلسلہ میں فرمایا کہ "نان شعیر" ہی پر "قوت حیدری" اور "قوت ایمانی" کا مدار رہا ہے، ہندوستان کے بزرگان دین اور خصوصاً صوفیہ کرام نے فاقے کرکے یہاں کے لوگوں کے اخلاق و کردار کو سنوارا ہے، اور یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، کے خلفاء میں ایک بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور گزرے ہیں، جو ہانسی میں رہتے تھے، سلطان محمد تغلق وہاں گیا، تو شہزادہ فیروز کو ایک لاکھ تنکے دیکر ان کی خدمت میں بھیجا، شیخ نے اتنی بڑی رقم دیکھ کر فرمایا، یہ درویش ایک لاکھ تنکے لے کر کیا کرے گا، درویش کے لیے تو دو سیر کھچڑی اور ایک سیر روغن کافی ہے، جب ان سے زیادہ اصرار کیا گیا تو صرف دو ہزار رکھ لیے، اس میں سے بھی کچھ تو اپنے مرشد کے مزار کے لیے اور بقیہ فقراء میں تقسیم کردیے،

دار المصنفین کی یادگار مجلسوں میں ایک مجلس یہ بھی تھی، اور جب یہ مجلس یاد آتی ہے، تو خیال ہوتا ہے کہ زندگی کے جو دن اس میں گذرے وہ بہترین دنوں میں سے تھے، مولانا جب

رخصت ہونے لگے تو ان کی خدمت میں دار المصنفین کی طرف سے مصارف سفر پیش کیے گئے، انھوں نے یہ کہکر لینے سے انکار فرمایا کہ میں تو اپنے گھر آیا ہوں، گھر والوں سے اخراجات لینا کیا معنے، ان کے اس اخلاص سے دار المصنفین کا ہر فرد متاثر ہوا،

مئی ۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف گھر گیا، تو قدمبوسی کے لیے گیلانی جانے کا قصد کیا، لیکن اہل وطن نے مولانا کو میلاد النبی کی ایک مجلس میں تقریر کرنے کے لیے اصرار سے مدعو کیا تھا، وہ اس وقت قلب کے مریض ہوچکے تھے، ڈاکٹروں نے تقریر کرنے کی ممانعت کردی تھی، مگر وہ اپنی خلقی مروت میں عزیزوں کی فرمایش رد نہ کرسکے، اور دیسنہ تشریف لائے، یہ انکی تقریر سننے کا پہلا اتفاق تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک سورہ والضحیٰ کی تفسیر کی روشنی میں بیان کی، اس بیان کا طرز تو سیدھا سادہ تھا، لیکن اس قدر موثر تھا کہ پوری مجلس رسول اکرم کے جام محبت سے سرشار اور مخمور ہورہی تھی، اس زمانہ میں گاؤں والے تقسیم ہند کے نتائج سے متاثر تھے، ان پر بڑی یاس و ناامیدی چھائی ہوئی تھی، مولانا نے ان کی تسکین و تسلی کے لیے بڑی وضاحت سے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں، ایک مکی اور ایک مدنی، ہندوستان کے مسلمانوں کو آپ ہی کے اسوۂ حسنہ پر چل کر اب مکی زندگی بسر کرنی ہے، انھوں نے اس کو کچھ ایسے دلنشین انداز میں بیان کیا کہ گاؤں والوں کو بڑی ڈھارس ہوئی، تقریر کے آخر میں گنوی زبان میں ایک نعت پڑھی جو ان ہی کی فکر سخن کا نتیجہ ہے، ان کے پڑھنے کے انداز میں کچھ ایسا درد واثر تھا کہ ان کی ترنم آواز آج تک کانوں میں گونج رہی ہے، اس نعت کا ایک بند ذیل میں درج ہے، شاید ناظرین کو بھی لطف حاصل ہو،

دنیا بھٹکی پھرتی، چھا گلئے تھا اندھیالا رے — دکھی سکھی راجہ پرجا سگرو تھے متوالا رے
من کی سونی نگری پر پڑل تھے کئی تالا رے — جنے دیکھو چورے چور، کوئی نہیں رکھوالا رے
بپتا کی ان گھڑیوں میں آئی گیو کملی والا رے

اس قسم کی نعت میں وہ اپنے کو "سوامی دھرمی جی گیلانی والے" کہتے تھے،

جولائی ۱۹۵۳ء میں ان کی قدمبوسی کے لیے گیلانی حاضر ہوا، گو یہ گاؤں راقم کے گاؤں دیسنہ سے صرف دو کوس کے فاصلہ پر ہے، لیکن ایک عرصہ کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا تھا، گیلانی پہنچ تو سواری کا یکہ آموں کے ایک بڑے باغ میں رکا، معلوم ہوا کہ یہ مولانا ہی کا باغ ہے، اس کے مقابل کئی بگھوں کا ایک اور بڑا سرسبز و شاداب باغ نظر آیا، یہ بھی مولانا ہی کا تھا، باغ کے بعد ایک چھوٹے سے چمن سے گذر کر مولانا کی مردانہ نشست میں پہنچا، یہ ایک دو منزلہ چھوٹی سی عمارت تھی، جو مولانا نے خاص اپنے لیے بنوائی تھی، اسی سے متصل ایک بہت بڑا دو منزلہ زنان خانہ تھا، مردانہ نشست کے سامنے ایک تالاب تھا، اس سے ذرا کچھ فاصلہ پر ایک چھوٹا سا آم کا ایک اور باغ تھا، یہ بھی مولانا ہی کا تھا، ان کو آموں سے بڑا ذوق تھا، بہار، حیدرآباد، بمبئی، لکھنؤ اور ملیح آباد کے مشہور آموں کے درخت انھوں نے منگوا کر لگائے تھے، اور جس طرف کی نظر اٹھتی ان کو اپنے لگائے ہوئے باغ نظر آتے تھے، انکے مکان اور باغات کو دیکھکر انکی فارغ البالی اور خوشحالی کا اندازہ ہوتا تھا، مگر خود انکی سادگی دیکھکر انکے علم کی گہرائی کا یقین آتا تھا، اس گہرائی کو دیکھکر ان کی سادگی پر تعجب ہوتا، ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی، اسی پر قلم اور دوات رکھ لیتے، اور علم و فن کا خزانہ لٹاتے رہتے، چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے، ان پر معمولی سا فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا، قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا، ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے، کمرے میں چار بڑی بڑی الماریوں میں منتخب کتابیں تھیں، یہی ان کا آفس اور کتبخانہ سب کچھ تھا، لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے، تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی سا ڈبہ گھسیٹتے، اس میں مٹی کے تین کلھڑوں میں کتھا، چونا اور ڈلی تھی، اور کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان

پتے ہوتے، یہ پاندان ان کی ساری زمینداری کھیتی، باغ اور گرانقدر تنخواہ کا حاصل تھا، جسکے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے، بقیہ کسی اور چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا، اس ڈبہ سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر پھر تر و تازہ ہو جاتے، اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی سے رواں ہو جاتا، جب ان کی نظر اپنے باغوں کی طرف اٹھ جاتی تو قلم اور تیز ہو جاتا، شاید ان کے سب اچھے مضامین اس زمانہ میں لکھے گئے، جب درختوں کے خوش رنگ آم ان کے کیف و سرور میں اضافہ کرتے رہتے تھے،

ان کے صرف ایک لڑکا اور لڑکی ہے، لڑکا اس وقت پاکستان میں ایڈمنسٹریٹو سروس میں ہے، اور لڑکی ان کے منجھلے بھائی مکارم احسن صاحب کے صاحبزادہ سے بیاہی ہوئی ہے، مولانا کی ساری دلچسپی و محبت مکارم صاحب ہی کے ساتھ تھی، وہی ان کے ذہنی اور قلبی سکون کے سرچشمہ تھے، اگر مولانا کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جاتا جہاں آموں کا ایک باغ ہوتا، اور ان کے سامنے مکارم احسن صاحب ہوتے اور ان کو قلم، دوات اور کاغذ دیدیا جاتا تو وہ یہی سمجھتے کہ ان کو جنت نعیم کی ساری نعمتیں مل گئی ہیں، گیلانی میں ان کو یہ ساری چیزیں میسر تھیں، اس لیے وہاں سے ہٹنا کسی حال میں پسند نہ کرتے تھے، صاحبزادے نے بار بار اپنے یہاں بلایا، پنجاب یونیورسٹی میں ان کو ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی جگہ پیش کی گئی، کراچی یونیورسٹی نے اصرار کے ساتھ بلایا، لیکن انھوں نے اپنی جنت کسی حال میں چھوڑنا پسند نہیں کی، ان کو اپنے کمرہ کی کھری چارپائی پر دنیا کی ساری لذتیں حاصل تھیں، اسی پر بیٹھ کر وہ لکھتے رہتے تھے، اور مکارم صاحب اپنے دیہی کاموں میں مشغول رہتے تھے، اور جب وہ کھیت اور باغ کو دیکھکر واپس آتے تو مولانا قلم چھوڑ دیتے، پھر ان کی دنیا باغ کی کیاریوں، کھیتوں، مینڈوں اور کاشتکاروں کے جھگڑوں کی باتیں ایسی دلچسپی سے سنتے کہ معلوم ہوتا کہ ان کے لیے اس سے زیادہ لذیذ تر حکایت

اور کوئی نہیں، جب کوئی اہل علم کہیں سے ان سے ملنے کے لیے آجاتا اور مکارم صاحب موجود
ہوتے تو مولانا خود خاموش ہوجاتے اور مکارم صاحب ہی علمی گفتگو شروع کر دیتے جو مولانا
کی کہی ہوئی باتوں کی صدائے بازگشت ہوتی، لیکن خود مولانا اس کو بڑے غور و انہماک سے
سنتے، اور شاید وہ غایت محبت میں مکارم صاحب کو اپنے سے زیادہ علم کا اداشناس اور
نکتہ ور سمجھنے لگے تھے، جب مکارم صاحب اٹھ کر چلے جاتے تو مولانا کے منہ سے پھر موتی جھڑنے
لگتے ان کے اس وصف کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی،

اس ملاقات میں، ان کی حکیمانہ ظرافت سے دن بھر محظوظ ہوتا رہا، ایک موقع پر جب ہندوستان
و پاکستان کے مسلمانوں کا ذکر آیا تو بڑے اذعان و اعتماد کے ساتھ فرمایا کہ میں ہندوستان کے
مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں اور اس کی وضاحت میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا،
کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید کا لڑکا اسلامیہ اسکول میں تعلیم پاتا تھا، اس کے باوجود
اس کے عقائد خراب تھے، مرید نے حضرت مولانا سے اس کی شکایت کی، انھوں نے فرمایا لڑکے کو
اسلامیہ اسکول سے نکال کر کسی غیر مسلم اسکول میں داخل کردو، مرید نے ایسا ہی کیا، کچھ دنوں کے
بعد مرید نے اطلاع دی کہ لڑکا اب پھر اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے، اور کچھ دنوں کے بعد بالکل
صحیح راستہ پر آگیا، مرید نے مولانا تھانویؒ سے پوچھا کہ یہ طریقۂ علاج سمجھ میں نہیں آیا، مولانا نے
فرمایا کہ لڑکا جس ماحول میں تھا، اس کے خلاف جانا پسند کرتا تھا، اس لیے جب وہ غیر مسلم اسکول
میں چلا آیا تو وہاں کے ماحول کے خلاف اسلامی شعار کی طرف مائل ہوگیا، مولانا گیلانیؒ نے
یہ واقعہ بیان کرکے فرمایا کہ پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہو جائیں گے، اللہ ہی
بہتر جانتا ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردعمل ہوگا، وہ میری نظر میں
امید افزا ہے، ان میں مذہبی احساسات اور ملی جذبات کی بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوت

مدافعت موجود ہے، جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی، جیسا کہ صدیوں سے رہی ہے، ہندوستان
میں باہر سے جو قومیں آئیں، وہ سب یہاں کی قوموں میں ضم ہوگئیں لیکن مسلمانوں نے اپنی
انفرادیت باقی رکھی، ان کی مذہبی غیرت و حمیت میں بڑا استحکام ہے، جو کمزور ہو سکتا ہے
لیکن ختم نہیں ہو سکتا، اس پر ضرب کاری پڑ سکتی ہے، لیکن اس کا کوئی استیصال کرنا چاہے
تو ممکن نہیں، مولانا کچھ اس یقین کے ساتھ یہ گفتگو فرما رہے تھے کہ مجھکو بھی ہندوستان کے مسلمانوں
کا مستقبل تاریک نظر نہیں آرہا تھا،

اس ملاقات کے چار مہینے بعد جب نومبر ۱۹۵۳ء میں مولانا نے حضرت سید صاحب
کے انتقال کی خبر کراچی ریڈیو سے سنی، تو کلیجہ تھام کر زمین پر بیٹھ گئے، اور ان کو محسوس ہوا
کہ ان پر قلب کا شدید حملہ ہوا ہے جس سے وہ جانبر نہ ہو سکیں گے، اسی پریشانی میں انکی
زبان سے نکلا

آج محفل علم کی افسوس سونی ہوگئی　　دین و دانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار
اب کریگا کون ہم میں دین کے اسرار کو　　کاوشِ تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

پھر اس میں کچھ اور اشعار بڑھا کر پورا ایک مرثیہ لکھدیا، جس کی ایک نقل دار المصنفین کو
بھی بھیجی، حضرت سید صاحب کی رحلت پر پورا دار المصنفین سوگوار تھا، ان کے اس مرثیہ نے
اور بھی سوگوار بنا دیا، اور جب مولانا ابو الحسن علی ندوی نے حضرت سید صاحب کی تعزیت
میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں جلسہ کیا تو مولانا نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود اس میں شرکت
کے لیے گیلانی سے لکھنؤ سفر کرنے کی زحمت گوارا کی، اس جلسہ کے ایک اجلاس کی صدارت
بھی انھوں نے کی تھی اور حضرت سید صاحب پر ایک طویل مقالہ بھی پڑھا تھا، وہ اندرونی طور
پر تو بہت مغموم اور ملول تھے، اور مقالہ پڑھنے میں ان کے آنسو رواں ہو جاتے تھے، لیکن انکی

سدا بہار طبیعت کی شگفتگی اور سنجیدہ ظرافت کا اظہار بھی موقع بموقع ہوتا رہا، حضرت سید صاحب پر مقالہ پڑھ رہے تھے، تو سیرۃ النبی کے سلسلہ میں ایک ایسا مقام آیا جس کی وضاحت ایک نے باطنی لطیفہ کے ذریعہ سے کی، فرمایا کہ والد صاحب کو اپنی کسی جائداد کے سلسلہ میں عدالتی کارروائی کرنی پڑی، اس مقدمہ کی تحقیقات کے سلسلہ میں ایک ہندو مجسٹریٹ ان کے یہاں آیا اور ہمدردانہ پوچھا کہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی ولی گزرا ہے تو میں کاغذ میں ذکر کر دوں، والد صاحب نے فرمایا کوئی ولی تو نہیں گزرا ہے لیکن نبی گزرا ہے، مجسٹریٹ نے کہا نبی سے کام نہیں چلے گا، ولی کی ضرورت ہے، اس کی نظر میں نبی سے زیادہ ولی کی اہمیت تھی،

اس موقع پر ندوۃ العلماء میں بڑا شاندار اجتماع ہوا تھا، لکھنؤ کے علاوہ بھوپال، پھلواری شریف، دریاباد اور اعظم گڈھ کے بہت سے علماء و فضلاء جمع ہوئے تھے، لیکن عام اجلاس اور نجی مجلسوں میں مولانا ہی بڑے چھوٹے سب کا مرجع بنے ہوئے تھے، اور ہر شخص ان کی باتوں کی مٹھاس اور نرمی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، موضوع سخن زیادہ تر حضرت سید صاحبؒ ہی کی ذات گرامی تھی، ایک موقع پر فرمایا کہ سید صاحب کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ اپنے علم و فضل کے باوجود حضرت تھانویؒ کے آستانے پر جا کر جھک گئے، پھر کہنے لگے کہ اگر دل کی تربیت نہ ہو تو عرش دماغ کو روشن کر کے آدمی نہ خود کوئی نفع حاصل کر سکتا ہے، نہ دوسروں کو پہنچا سکتا ہے۔ جب مجھکو خبر ملی کہ سید صاحب تھانہ بھون سے منسلک ہو گئے تو میں بے حد مسرور تھا، اور ان کو مبارکباد کے کئی خط لکھے،

لکھنؤ سے واپسی کے بعد میں نے حضرت سید صاحب کے نام مشاہیر کے جو خطوط دار المصنفین میں محفوظ ہیں، ان کو دیکھنا شروع کیا، تو ان کے بیعت ہونے کے سلسلہ میں مولانا گیلانی کے بہت سے عجیب و غریب خطوط نظر آئے، مثلاً ایک مکتوب مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۲ء

لہ یہ واضح رہے کہ مولانا نسباً سید تھے،

میں کس والہانہ انداز سے تحریر فرماتے ہیں،

"الحمد للہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت و عمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لیے مقدر تھی، آستانۂ تھانہ بھون کی حاضری کا حال مولانا عبد الباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا، ھنیئا لکم ثم ھنیئا لکم الصادقین کی معیت آپ کو مبارک ہو، انعمت علیہم کے صراط کی ہدایت اصل ہدایت ہے، غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ یہی "حسن اولئک رفیقا" کی سند کے ساتھ الرفیق الاعلیٰ کی مجلس انس کی شرکت ہر قسم کی مجلسوں سے گذرنے کے بعد انشاء اللہ رسوخ تام کی بشارت و ضمانت کی حامل ہے، عجب راہ ہے، نہ یہاں محاسدہ ہے، نہ مباغضہ، نہ منافسہ، نہ مقابلہ، بلکہ ہر ایک دوسرے کے لیے داعی الحمد مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں، لیکن اب تک وہ حلاوتیں دل ناکام کو یاد ہیں، جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں، آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف باعث عبرت ہے"

اس خط میں مولانا کے آئینۂ دل کا جوہر نظر آرہا ہے، وہ حضرت سید صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے تھے، لیکن ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ راہ سلوک پر ان سے بہت پہلے گامزن ہوئے، اور جس زمانہ میں حضرت سید صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ

خرد نے مجھکو عطا کی نظر حکیمانہ

تو مولانا یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ

سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

ان پر یہ حقیقت بہت پہلے آشکارا ہو چکی تھی کہ

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق ‌ ‌ ‌ ‌ عقل انسانی ہے فانی، زندۂ جاوید عشق

مکتوب بالا میں ان کے "دلِ ناکام" کی صدا در اصل ان کے "دلِ کامگار" کی غمازی کر رہی ہے، مگر اس کے اظہار میں کیسی حلاوت ہے، وہ اپنی "صحتِ نفس" کی خاطر جو "مخالفتِ نفس" کر رہے ہیں، وہ لائقِ غور ہے، اور یہ درجہ سلوک کی کٹھن منزلوں کے طے کرنے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے، جب حضرت سید صاحبؒ کو مولانا تھانوی کے یہاں سے خلافت ملی، تو مولانا "محاسدہ" "منافسہ" اور "مقابلہ" سے پاک ہو کر "تجرید" کی حالت میں ۳ر فروری ۱۹۴۳ء کو لکھتے ہیں:

سیدی الامام! بشریٰ لکم وطوبیٰ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

این قالبِ فرسودہ گر از کوئے تو دور است

الکلب علی بابک لیسلا ونہارا

کچھ عجب حال ہے، جب آپ کی زیارت موجبِ اجر و ثواب بنی تو جسے ثواب واجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے، آپ کہاں سے کہاں پہنچے اور پہنچائے گئے، اور ہم جرسِ کارواں کی صرف آواز ہی سنتے رہے، مولانا عبد الباری صاحب سے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کی جو تفسیر آپ کے ساتھ ہو رہی ہے، اس کی خبر میں سنتا رہتا ہوں کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لیے پاتا ہوں، آپ کو اس کا شاید اندازہ نہ ہوگا، خبر ملی تھی کہ آستانۂ حکیم الامت مدظلہ العالی سے سندِ خلافت بھی حاصل ہو چکی ہے، معارف کے شذرات میں جو کچھ حسبِ قلم سے شائع ہوئے، اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کر سکتا ہے، بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی، میرے نزدیک تو خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے، جب سب کچھ گناہوں سے مٹ جائے اور

نہ خدا خواہم و نہ غیر خدا خواہم بخدا   کہ نیم بندۂ غیر و نہ خدائے دگر است

اسی ایک حقیقتِ واقعیہ کا تحقق تام بس سب کچھ صرف یہی ہے۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کے مقام پر سرفرازی نصیب ہوئی، ان شاء اللہ فردوس میں اس کے نزل کی تیاری ہے، ایسی مہمان نوازی کو لا یبغون عنھا حولا اس سے کہ لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر۔ طلبِ لامحدود کے لیے مطلوب کو بھی لامحدود ہونا چاہیے، بلکہ مطلوب کی لامحدودیت ہی نے اس طلب کو پیدا کیا، جس کی "طلوعیت" کسی نقطہ پر ختم نہیں ہوئی کسی راہ میں ہو، خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنی فطرت کے اس جذبہ کو اسی راہ پر لگا دیا جس کے پیدا کرنے والے نے اسے پیدا کیا تھا کہ آدمی نے اس طلوعیت کو خود نہیں پیدا کیا، ورنہ خلق کے فاعل کا مجہول کیوں کیا جاتا، دیکھیے قدم بوسی کی تمنا کب پوری ہوتی ہے اور حالات کیا عرض کروں ؎

ہمیں نالۂ ماند مسکیں حسن ما   وزاں روز ترسم کہ ایں ہم نماند

واللہ اعلم نسلِ انسانی کی دیوار کس کروٹ کرنے والی ہے، خیر ہم تو بہت جی چکے، اتنا کہ حساب سے عہدہ برآ ہونا صرف فضل ہی کے محول ہے، اب تو سامنے زیادہ یہی حال ہے

عنقریب است کہ از ما اثرے باقی نیست   شیشہ بشکستہ و مے ریختہ و ساقی نیست

یہ مکتوب چھپنے کے لیے نہیں لکھا گیا تھا، محض ایک نجی خط ہے، جو قلم برداشتہ لکھا گیا ہے، لیکن اس کے پڑھنے کے بعد دل پر یہ اثر پڑتا ہے کہ یہ تحریر ایک پاک دل اور ایک پاک طینت ہی انسان کے قلم سے نکل سکتی ہے، اس میں ایسا سالکانہ ذوق و شوق اور عارفانہ کیف و بیخودی ہے، جو لکھنے والے کے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح کا پتہ دیتی ہے، اور "گوہرِ عشق"، "گوہرِ روح" اور "گوہرِ معرفت" کے پرکھنے والے جوہری نے حضرت سید صاحبؒ کو ۳ر مارچ ۱۹۴۳ء کو پھر ایک نجی مکتوب میں تحریر فرمایا۔

سیدی الکریم ، زادکم اللہ عرفانا و قربا۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

یقیناً ہم اپنیوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یوں ہی بلندی کیا کم تھی، اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت و خلافت کی دولت سے سرفراز ہیں، چالیس سال تک مولانا شبلی کی، اور عمر عزیز کے چہل سالہ کے بعد مولانا تھانوی کی نیابت کی۔ ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا، خلافت کے زمانہ میں لباس کی قیمت چند درہم سے آگے نہ بڑھی، پوچھنے والے نے ولید اور عبدالملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا، مشہور جواب ہے کہ تمنا کی مدینہ کی ولایت کی، پوری ہوئی، فاطمہ بنت عبدالملک سے شادی کی، پوری ہوئی، خلافت کی، پوری ہوئی، اب جنت کی تمنا کی ہے، صرف اس کا سامان ہے، آپ نے بھی یہی کیا اور خوب کیا، ومثل ھذا فلیعمل العاملون، بارک اللہ فیکم و ذلکم۔

مولانا کے خطوط سے کیسی وضاحت ہو جاتی ہے کہ حضرت سید صاحب نے کیوں تھانہ بھون کے آستانہ پر جا کر اپنی جبین نیاز رکھ دی تھی،

مقام عقل سے آساں گذر گیا اقبال   مقام شوق میں کھو یا گیا وہ فرزانہ

جب راقم کا دل مولانا کی روحانی عظمت سے متاثر ہو رہا تھا، ان ہی دنوں ان کا ایک مضمون "مسلمانوں کا اندلس مسلمانوں کی نگاہ میں" معارف میں شائع ہوا، جس کی سطر سطر سے اسلام کے لیے ایک بے چینی اور تڑپ ظاہر ہوتی ہے، اور ایک عارفانہ بصیرت سے دکھایا گیا ہے کہ اگر مروانی حکومت اسلام کی تمکین اور استقرار کے لیے قرآنی نصب العین سامنے رکھتی تو وہ ختم نہ ہوتی، لیکن ان کی حکومت کے زمانے میں قرآن سے چشم پوشی اختیار کی گئی، قرآنی دعوت کے پیش کرنے والے نمونوں سے اعراض کیا گیا، اور ان لوگوں کو جو اسلام اور پیغمبر اسلام

کو ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار دینے پر اصرار کرتے تھے، رسوا و بدنام کیا، اور ان کے مقابلہ میں مستقل محاذ بنا لیا گیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ہی بھڑکائی ہوئی آگ میں مروانیوں کی حکومت خود ہی جل بھن کر ختم ہو گئی۔ آخر میں مولانا نے ایک بہت ہی حکیمانہ بات لکھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے وہ اندلس زیادہ پائدار ہوتا جس میں خواہ الحمراء، الزہراء، قرطبہ اور غرناطہ نہ ہوتے مگر مسلمانوں پر جو فرض آخر الامم ہونے کی حیثیت سے عائد کیا گیا ہے، اگر اس کو وہاں کا حکمراں طبقہ پیش نظر رکھتا تو وہ سیاسی مصائب و آفات کے جن گردابوں میں تہ و بالا ہو کر رہ گئے، شاید یہ نوبت پیش نہ آتی، "مولانا کا یہ پیام آج بھی تمام اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لیے ہے، یعنی اگر وہ مادی اور نمائشی کاموں کو انجام دینے کے بجائے مسلمانوں کے اخلاق، کردار اور سیرت کا الحمراء اور قرطبہ بنانے میں مشغول ہو جائیں تو کوئی قوت ان کو نہیں مٹا سکتی،

اس مضمون کے پڑھنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد مجھکو آگرہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں تاج محل دیکھنے گیا، تو اس کی غیر معمولی صناعی، بے مثل کاریگری، اور دلکشی و رعنائی دیکھنے کی ساری مدت مولانا کے مضمون کو یاد کرکے جاتی رہی، اور یہی خیال آیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان حکمراں شاندار عمارتیں بنانے کے بجائے یہاں کے مسلمانوں کے کردار کا تاج محل اور اخلاق کا لال قلعہ بنا گئے ہوتے تو آج ان کی تاریخ کچھ اور ہوتی،

نومبر ۵۳ء میں مولانا کے قلب پر جو حملہ ہوا تھا، اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کر لی، مارچ ۵۴ء میں ان پر اسکا ایسا سخت حملہ ہوا کہ امید زیست جاتی رہی، لیکن ان کے جاں نثار بھائی مکارم صاحب نے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، ان کو گیلانی سے پٹنہ اسپتال لے آئے اور معالجہ میں روپے پانی کی طرح بہائے، وہ پٹنہ ہی میں مقیم تھے کہ میں ان کی عیادت کے لیے حاضر ہوا، ڈاکٹروں نے ان کو بہت ہی کم بولنے کی اجازت دی تھی، اور مکارم صاحب

نے اور بھی زیادہ پابندی عائد کر رکھی تھی، لیکن مولانا نے اس ناچیز کو دیکھکر ساری پابندیاں توڑ دیں،
مکارم صاحب روکتے رہے، مگر ان کی باتیں چل نکلیں تو پھر کسی کے روکے نہیں رکیں، زیادہ تر
تفریحی باتیں رہیں، لیکن ان میں بھی ان کی دقت نظر دکھائی دیتی تھی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی
کا ذکر آیا، تو فرمانے لگے کہ ان کی طبیعت میں بچپن ہی سے بڑی نکتہ رسی تھی، وہ دیوبند میں تعلیم
پا رہے تھے، تو ان کے کسی ہم درس کی کتاب غائب ہو گئی، اس نے درس کے وقت مدرس سے
شکایت کی کہ کسی لڑکے نے اس کی کتاب چرالی ہے، مدرس صاحب جھلا کر بولے، افسوس ہے کہ
دیندار لوگ بھی چور ہوتے ہیں، مولانا اشرف علیؒ اسی وقت بول اٹھے کہ ایسا نہ فرمائیں، بلکہ یہ کہیں کہ
"کوئی چور دیندار لوگوں کے ساتھ پڑھنے آگیا ہے" مولانا گیلانی کو ارادت تو مولانا محمود الحسنؒ سے
تھی، لیکن ان کو مولانا تھانویؒ سے بھی بڑی عقیدت تھی، اور ان کا ذکر ہمیشہ بہت ہی محبت اور
احترام سے کرتے، وہ اسی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر طبقہ میں محبوب رہے، پٹنہ میں ان کے
معالج ڈاکٹر عبدالحئی تھے، جو وہاں کے مشہور و مقبول ہونے کے علاوہ بڑے مشغول طبیب ہیں، لیکن وہ
مولانا کا علاج بڑی محبت اور تن دہی سے کر رہے تھے، اور اسکو بڑی سعادت سمجھتے تھے،

کچھ دنوں کے بعد وہ پٹنہ سے گیلانی واپس چلے گئے، اور مکارم صاحب کی نگرانی میں بڑی
احتیاط سے زندگی بسر کرنے لگے، ان کو لکھنے پڑھنے سے بالکل منع کر دیا گیا تھا، لیکن وہ حریصانہ
نظروں سے اپنی کتابوں کی الماریوں کی طرف دیکھا کرتے تھے، شیخ ابن عربی پر لکھنے کیلئے دار المصنفین
سے بہت سی کتابیں منگائی تھیں، ان کو کبھی کبھی الٹ پلٹ کر دیکھ لیتے تھے، مگر مکارم صاحب
کی تیکھی نظروں کو دیکھکر بند کر دیتے، گو ہم لوگوں کو جب خطوط لکھتے تو اپنی زندگی کی مایوسی
کے باوجود علمی دنیا میں مراجعت کی امیدیں بھی دلاتے، ان کو دنیا میں اگر کوئی حسرت باقی
رہ گئی تھی، تو یہی کہ بعض چیزیں جو ان کے سینہ میں ہیں ان کو سفینہ میں منتقل کرنے سے معذور

ہو رہے تھے،

راقم مئی ۵۶ء میں اعظم گڈھ سے وطن پہنچا تو ان کی قدمبوسی کے لیے گیلانی پہنچنے کا
ارادہ کر رہا تھا کہ ایک روز ڈاک سے ان کا حسب ذیل محبت نامہ ملا،

عزیز محترم ...[1] ... السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ!

اتنے طویل المدت مریض کے متعلق یہ واقعہ ہے کہ مرجانے یا تندرست ہو جانے کا
فیصلہ قدرتی ہے، لیکن کیا کیجئے، آپ کا یہ مریض المسمی بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے
اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے، اسی حال میں گمن ہے جس میں دیکھا گیا، کل
شاہ صاحب[2] قبلہ کا نوازش نامہ ملا جس میں آپکے دیسنہ پہنچنے کی خبر درج تھی، دار المصنفین
کی جو امانت ہمارے پاس محفوظ ہے، اس کو آپ کے حوالہ کر دینا چاہتا ہوں، کیونکہ اب
شیخ ابن عربی پر کچھ لکھوں تو ضرورت ہے کہ دوسری دفعہ پیدا کیا جاؤں، اب فرمایئے کہ
اس کے لیے کیا کروں، کیا دیسنہ ان کتابوں کو کسی کے معرفت بھیج دوں! مگر آپ کی ملاقات
سے محرومی معمولی محرومی نہ ہوگی، بہرحال جو رائے عالی[3] ہو، اس سے مطلع فرمائیں،
ڈاک سے اس لیے خط بھیج رہا ہوں کہ زمینداری ختم ہونے کے بعد اب جھپٹی چاپتی کی
کوئی راہ ڈاک کے سوا باقی نہیں رہی.......

اس خط کے فوراً ہی بعد میں گیلانی حاضر ہوا تو ان کے چہرہ کو تو منور لیکن جسم کو نحیف،
لاغر اور کمزور پایا، اور ان کے دونوں پاؤں پر آماس دیکھکر عجیب کیفیت گذری، مجھکو دیکھکر
چارپائی سے اٹھ کھڑے ہوئے، بڑی محبت اور گرمجوشی سے بغل گیر ہو کر فرمایا "خوب آگئے

[1] مولانا اپنے اخلاص و شفقت میں چھوٹوں کے لیے بھی ایسے القاب لکھ دیتے جنکے وہ مستحق نہ ہوتے، اس لیے کچھ الفاظ
حذف کر دیے گئے ہیں [2] جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مراد ہیں [3] یہ الفاظ ان کے ظرف عالی کا ثبوت ہے،

اب چل چلاؤ ہے"۔ یہ سن کر دل پر ایک چوٹ لگی، مکارم صاحب موجود تھے، اس لیے وہ رک رک کر باتیں کرتے رہے، مگر جب مکارم صاحب اٹھکر چلے گئے، تو گفتگو کا سرچشمہ بہہ نکلا، فرمانے لگے گیلانی بہت عزیز ہے، اس لیے یہیں پڑا ہوں، پھر گیلانی پر اپنی ایک مطبوعہ مثنوی پڑھنے کو دی جس کے بعض اشعار یہ ہیں!

مسقط الراس وہ وطن پیارا — عہد طفلی کا اپنے گہوارا
منظر اس کا ہے کیا دیدہ زیب — اف وہ مینو سواد زہد فریب
وہ درختوں کی اس کے رعنائی — اور باغوں کی حسن و زیبائی

پھر بڑی احتیاط سے ایک ملفوف خط دیکر کہا "اس کو پڑھو، میں نے اسی خط کی بنا پر گیلانی نہیں چھوڑا" میں نے وہ خط لیا تو اس کے اوپر ان ہی کے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ فقرے تھے،

"ایک تاریخی مکتوب یعنی نامۂ سلیمانی جس میں گیلانی میں قیام پر اصرار کیا گیا ہے"

میں نے خط کھول کر پڑھا تو معلوم ہوا کہ حضرت سید صاحبؒ نے ان کو ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء میں بھوپال سے حیدرآباد دکن تحریر فرمایا تھا،

محب اعز واعز، متعنا بربرکاتکم،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، میں لوگوں کی اس حرکت کو پسند نہیں کرتا کہ بہار کے مقتولین دشمنوں کا ایسا نقشہ کھینچیں کہ باقی ماندہ دل پر رعب اور ہراس چھا جائے، ورنہ ایک دن پورا ہندوستان خالی کرنا پڑے گا، آپ اب بھی گیلانی میں ہیں، اور آیندہ بھی یہیں رہیں گے"

ابھی خط پڑھ ہی رہا تھا کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت سید صاحبؒ نے میرے لیے پیشین گوئی کی تھی، بلکہ ان کا حکم تھا، اسی لیے میں یہاں پڑا ہوں،

حضرت سید صاحبؒ سے ان کی یہ عقیدت کتنی قابل قدر ہے، پھر وہ ان ہی کے متعلق

دیر تک گفتگو کرتے رہے، اور فرمانے لگے، میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۳۰ء میں ہی انکو مولانا تھانویؒ کے پاس بھیجا تھا، اور جب وہ مولانا سے مل کر واپس آئے تو کچھ خوش نہ تھے، ملاقات کی تفصیل سے اندازہ ہوا کہ اس موقع پر انھوں نے مولانا تھانویؒ سے پورے عالمانہ انداز میں گفتگو کی تھی، میں نے سید صاحبؒ سے عرض کیا آپ کی ناخوشی بے جا نہیں، مولانا تھانویؒ کو آپ تو پسند آئے لیکن آپ جس مقام سے بول رہے تھے، وہ ان کو پسند نہیں آیا، سید صاحب یہ سنکر پھڑک اٹھے، اسی سلسلہ میں مولانا نے فرمایا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ جب حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کے پاس پہنچے تو ایک روز حضرت گنج شکرؒ نے ان سے کہا "آؤ آج تم کو عوارف المعارف پڑھائیں"، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اس کتاب کو پہلے پڑھ چکے تھے، اور اس پر پوری طرح حاوی تھے، اس لئے ان کو خیال ہوا کہ درس سے ان کے علم میں کوئی اضافہ نہ ہوگا مگر مرشد کا حکم تھا، اس لیے کتاب لے کر پہنچے، درس میں کسی مسئلہ پر حضرت نظام الدینؒ نے بحث کرنے کی کوشش کی، حضرت فرید الدینؒ کتاب بند کرکے اٹھ کھڑے ہوئے، اور کئی روز تک حضرت نظام الدینؒ سے مخاطب نہیں ہوئے، مرشد کی یہ آزردگی دیکھکر حضرت نظام الدینؒ نے ان سے پوچھا، کیا میں نے درس میں کوئی غلط بات کہی تھی، حضرت گنج شکرؒ نے فرمایا نہیں، جو بات کہی تھی وہ تو صحیح تھی لیکن جس مقام سے تم کہہ رہے تھے وہ صحیح نہ تھا،

مولانا نے اس واقعہ کو کچھ ایسے موثر انداز میں بیان کیا کہ اس کو سنکر مجھکو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے سے تاریکی کے پردے اٹھ گئے، زندگی کو سمجھنے اور سلجھانے میں یہ کتنا اہم نکتہ ہے! راقم خاموشی کے ساتھ ان کی گفتگو کی روانی اور شیرینی سے لذت لیتا رہا، لیکن اسی زمانہ میں اپنے ایک عزیز ڈاکٹر محمد امام سپرنٹنڈنٹ پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال

سے وہاں کا ایک واقعہ سنا تھا، جو ان کی خدمت میں عرض کیا، وہ یہ تھا کہ اسپتال کے جنرل وارڈ میں ایک فوجی کپتان کا بچہ داخل ہوا، اس کی ماں تیمارداری میں تھی، جو آس پاس کے مریضوں کو بہت تنگ کرتی تھی، اور اس سے سب ہی پریشان تھے، بغل ہی میں ایک بوڑھا لیکن ظریف مریض بھی تھا، ایک روز فوجی کپتان وہاں آیا، بوڑھے مریض نے اشارے سے اسکو اور اسکی بیوی کو اپنے پاس بلایا، اور اس کی بیوی کو مخاطب کر کے کہا "بیٹی! ایک قصہ سنو، ایک شخص کہیں جارہا تھا کہ راستے میں اس کو اللہ میاں مل گئے، اس نے اللہ میاں سے پوچھا "آپ نے انسانوں کے کھانے کے لیے تو طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں، لیکن آپ خود کیا کھاتے ہیں؟ اللہ میاں بتانے پر راضی نہیں ہوئے، لیکن جب وہ بضد ہوا تو فرمایا، ہم بس ایک ہی چیز کھاتے ہیں، وہ انسان کا غرور ہے، یہ قصہ سنا کر بوڑھے مریض نے اس عورت سے کہا کہ بیٹی! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی اللہ میاں کی غذا نہ بن جائے"۔

یہ قصہ سن کر مولانا جو لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے، فرمایا کہ کیا خوب قصہ سنایا، پھر کلام پاک کی آیتیں پڑھ کر سنانے لگے، اور ان کی تفسیر میں فرمایا کہ اللہ میاں نے کہا ہے کہ میں نے سب کچھ اپنے بندوں کو دیدیا ہے، اپنے پاس کچھ نہیں رکھا، البتہ کبریائی کی ایک چادر ہے جس کو اوڑھے رہتا ہوں، اب اگر کوئی بندہ اس کو بھی مجھ سے لینا چاہتا ہے تو میں برہم ہو جاتا ہوں کہ اس کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس یہ چادر بھی رہے، اس مزاحیہ تفسیر میں گوش شنوا کے لیے کیا کچھ نہیں ہے،

ان ہی دنوں معارف میں چندر پرکاش جوہر کی ایک غزل شائع ہوئی تھی، سلسلۂ کلام میں مولانا نے پوچھا، یہ کون اہل دل ہیں؟ عرض کیا کہ ابھی بالکل ہی نوجوان ہیں، فرمایا کہ یہ تو کوئی دل ہی والا کہہ سکتا ہے ؎

یہ کمال ضبط غم ہے کہ سلیقۂ محبت — مرا دل تو رو رہا ہے مگر آنکھ تر نہیں ہے

پھر کہا کہ ظالم نے کیا کہہ دیا ہے

وہ تمام تر توجہ بایں سازشِ تغافل — وہ یوں باخبر ہیں جیسے انھیں کچھ خبر نہیں ہے

اور پھر بڑی حسرت سے یہ شعر پڑھا

غم جستجو کے صدقے وہ مقامِ دل بھی آیا — کہ بجز خیالِ جاناں کوئی ہم سفر نہیں ہے

شاید وہ اپنے "مقام دل" میں اپنے "ہم سفر" کو دیکھ رہے تھے۔

سلسلۂ کلام جاری تھا کہ مکارم صاحب آگئے، اس لیے وہ خاموش ہو گئے، پھر جب مکارم صاحب گاؤں کے قصے سنانے لگے تو مولانا ان کی گفتگو سننے میں محو ہو گئے۔

میرا قیام دن بھر رہا، آموں کا موسم تھا، اس لیے دسترخوان پر آموں کا ڈھیر تھا، خود مولانا نے صرف چند قاشیں کھائیں، لیکن آموں کی رغبت دیکھ کر اور ان کی تعریف سن کر بہت مسرور نظر آرہے تھے، مکارم صاحب کی گفتگو سننے کے بعد جب کبھی ان کو خود باتیں کرنے کا موقع ملتا تو وہ زیادہ تر اپنی موت ہی کا ذکر کرتے، اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا کہ اب ان کے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی ہے، ہاں دکھ تھا تو یہ کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے چاروں طرف کتابیں دیکھتے تھے لیکن پڑھ نہیں سکتے تھے، اور پڑھنے سے زیادہ لکھنے سے معذور ہو چکے تھے، وہ گویا اپنے آپ کو آب حیات کے پاس کھڑا دیکھتے لیکن اس کے پینے پر پابندی عائد تھی، ان کے لیے یہ تکلیف ناقابل برداشت تھی جس کو دور کرنے کے لیے کبھی اپنے چھوٹے نواسے انس کبھی پالتو تیتر اور مور سے دلچسپی لیکر وقت گزارنے کی کوشش کرتے۔

جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عجب پر درد منظر تھا میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر فرمایا، میں تو اب برابر یہی پڑھتا ہوں،

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبرا ؤ شاد — جی چکے بس تا بکے مرجاؤ شاد

منہ پھیرو اس نگاہ مست سے — برچھیاں سینہ پر تن کر کھاؤ شاد

اور یہ شعر تو گویا ان کی موت کی پیشین گوئی تھی،

میں نے مانا بخشوا لوگے گناہ — اور جو اس کی بھی نہ مہلت پاؤ شاد

اس کو پڑھ کر فرمایا، کن کن آرزوؤں کے لیے آدمی زندہ رہے، اور یہ اشعار سن کر تو میں بھی آبدیدہ ہوگیا،

خط شوق اپنا لفافہ میں رکھو — آرزوؤں کو کفن پہناؤ شاد

دے چکی اک عمر تک دنیا فریب — اب نہ اس دھوکے کے اندر آؤ شاد

لیکن وہ خود اس طرح مسرور اور شاداں ہوکر ان اشعار کو پڑھ رہے تھے جیسے اس دار المحن کو چھوڑ کر ایک ابدی دار المسرت کی طرف کوچ کے لیے بے چین ہوں،

جب میں ان سے رخصت ہوا تو یہ خیال کرکے دل بیٹھا جاتا تھا کہ اب شاید ملاقات کی نوبت نہ آئے، اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ حضرت سید صاحبؒ کی رحلت کے بعد کبھی کبھی مولانا کی صحبت میں جو ذہنی سکون اور روحانی لذت مل جاتی تھی، کہیں اس سے بھی محروم نہ ہوجاؤں۔

دلسنہ واپس آنے کے پانچویں ہی روز یعنی ۵ رجون ۱۹۵۶ء کو یکایک خبر ملی کہ مولانا جنت کو سدھار گئے، یہ خبر اتنی دیر میں ملی کہ شرکت جنازہ کی سعادت سے محروم رہا، دوسرے دن علی الصباح گیلانی پہنچا، جب مکارم صاحب نظر آئے تو مجھکو دیکھکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ مولانا سے صرف چار سال چھوٹے تھے، لیکن اس طرح رو رہے تھے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق باپ کی موت پر روتا ہو، بڑے بھائی نے اپنے چھوٹے بھائی سے جیسی محبت کی اس کی مثال بہت ہی کم ملے گی، وہ رو رو کر بیان کرنے لگے کہ بھائی مرحوم ادھر کئی روز سے

بہت اچھے تھے، گذشتہ رات کو اور بھی زیادہ خوش تھے، رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سنتے اور ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کرتے رہے، بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، ان کو دیر تک نیند نہیں آئی، مگر پھر سو گئے، صبح سویرے اٹھے، وضو کیا، کھڑے ہوکر فجر کی نماز ادا کی، وظیفہ پڑھا، پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئے، ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی، اس لیے چادر اڑھا دو، سوؤں گا، سوئے تو ابدی نیند سو گئے، اور جب ہم لوگوں نے سانس رکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرہ جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب ہوگیا تھا۔

کیسی اچھی موت پائی، ایک پاکیزہ روح اسی طرح عالم بالا میں منتقل ہوتی ہے، معلوم ہوا کہ جنازے میں آس پاس کے گاؤں کے ہندو مسلمان بکثرت شریک ہوئے تھے، اور اس چھوٹے سے گاؤں میں ہر طرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، اسی آمد میں مولانا مرحوم کے کچھ کاغذات اور کتابیں دیکھنے کا موقع ملا، ان کو مولانا عبد الماجد دریابادی مدظلہ العالی سے بڑا تعلق لگاؤ تھا، انکی ترجمہ کردہ "مناجات مقبول" کی تلاوت روزانہ کرتے، اسی کے ایک ورق پر حسب ذیل تحریر پڑھکر تسیر ہوئی۔

۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء۔ یکایک سونے کے وقت رات کو، قرآنی آیت اللہ یتوفی

الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا فیمسک التی قضی علیہ الموت

ویرسل الاخری الی اجل مسمی، کا خیال آیا، عجیب بات ہے کہ آخر میں فرما ہی دیا گیا ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں مشہور ہوگئی ہیں، حالانکہ اس نص قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ نیند جیسے آتی ہے، موت بھی اسی طرح آتی ہے، نیند آنے میں سونے والوں کی تکلیف کب ہوتی ہے، پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے، ہمارے استاد مولانا فراہیؒ سکرۃ الموت کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے کہ عند الموت مرنے والے

برنشہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی نے امام غزالی کی ان روایتوں کی تنقید کرائی تھی جن سے موت کے شدائد پر امام نے احیاء العلوم میں استدلال کیا ہے۔"

مولانا نے آیت مذکورہ سے جو استنباط کیا تھا، اسی کے مطابق ان کی موت ہوئی، جو بلاشبہ ایک مومن اور ایک عارف کی موت کہی جا سکتی ہے، انھوں نے شاید چشم بینا سے اپنی موت کا منظر پہلے ہی دیکھ لیا تھا،

مزار پر حاضری سے پہلے بعض اعزہ کے زنانخانے میں چلا گیا، تو وہاں عورتوں کو سوگوار اور اشکبار پایا، اور وہ کہہ رہی تھیں کہ جو بیوائیں ان کے مقرر کیے ماہانہ وظیفے پر زندگی بسر کر رہی تھیں اب ان کے دن کیسے گزریں گے، پھر اس کی تفصیل معلوم ہوئی کہ وہ کس طرح خاموشی سے ناداروں اور غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے،

جب ان کے مزار کی طرف چلا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ فضل و کمال کے خاتمہ پر آنسو بہانے، عالمانہ موشگافی اور نکتہ وری پر ماتم کرنے اور بہار کی علمی عظمت و فضیلت پر فاتحہ پڑھنے جا رہا ہوں، اور جب تربت نظر آئی تو بے اختیار آنسو نکل پڑے کہ آہ! ایک منور چہرہ، ایک لطیف جسم، ایک روشن ضمیر، ایک صاف طینت، ایک پاک دل، ایک پیکر محبت اور ایک مخزن علم اس تودۂ خاک میں دفن ہے، مگر دل یہ کہہ رہا تھا کہ قبول و مغفرت کا تاج ان کے سر پر رکھا جا چکا ہوگا، ان کے محبوب آم کے درختوں کی ہری ہری ڈالیاں ان کی تربت پر سایہ فگن تھیں، میں نقش حرماں بنا ہوا تھا، اور وہ اپنی زندگی کی ساری رعنائیوں سے نقش حیرت بنا رہے تھے، اور اقبال کا یہ شعر اچھی طرح ذہن نشین ہو رہا تھا،

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں — آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اور اقبال نے یہ شعر بھی شاید ان ہی جیسے بزرگوں کے لیے کہا ہے،

عشق ہو اصل حیات موت ہے اس پر حرام — مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

اور وہ یقیناً اپنے "دل الفت نسب" "سینۂ توحید فضا" "نگہ جلوہ پرست" اور "نفس صدق گزیں" کی وجہ سے "صاحب عشق" تھے، اور ان کو حیات ابدی حاصل ہے،

اور جب گیلانی چھوڑ کر واپس جا رہا تھا تو ان کے یہ اشعار یاد آرہے تھے،

یاد آتی ہے مجھکو گیلانی — مظہر لطف غوث سبحانی
مصدر رازہائے عرفانی — مطلع جلوہ ہائے روحانی
منبع علم مخزن حکمت — مرکز جاہ و عظمت و شوکت

گیلانی کی سرزمین میں ان کے آسودۂ خاک ہونے سے یہ اشعار کس قدر با معنی اور صحیح ہو گئے ہیں،

یونانی منطق کے قدیم عربی تراجم

از جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ

فاضل مضمون نگار کو ریاضیات اور عقلی فنون سے خاص ذوق ہے جس کو مسلمان عام طور سے فراموش کر چکے ہیں، اسی کے ساتھ وہ ایک صاحب نظر محقق بھی ہیں، انھوں نے اس مضمون میں پروفیسر پول کراوس کے ایک مقالہ پر جس کا ترجمہ گذشتہ مہینہ کے معارف میں شائع ہو چکا ہے، جیسی ناقدانہ اور تحقیقی نگاہ ڈالی ہے، اس سے اسکا اندازہ ہوگا، "م"

[اعتذار:- پروفیسر فرنسکو جبرئیلی نے ۱۹۳۲ء میں "مولفات ابن المقفع" کے عنوان سے مجلہ دراسات الشرقیہ" میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس میں پروفیسر موصوف نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ارسطاطالیسی منطق کی کتابوں کے قدیم ترین ترجمے کی نسبت عبد اللہ بن المقفع کی جانب (جیسا کہ قاضی صاعد اندلسی نے طبقات الامم میں اور ان کی تقلید میں جمال الدین ابن القفطی اور ابن ابی اصیبعہ وغیرہ متاخرین مورخین نے لکھا ہے) صحیح نہیں ہے، لیکن انھوں نے اپنے خیال کی تائید میں کوئی دلیل نہیں دی، بایں ہمہ اس غیر مدلل خیال سے انھوں نے یہ قیاس آرائی کی تھی:-

"اس لیے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ابن المقفع سریانی زبان جانتا تھا جس میں عموماً یونانی فلسفہ کے مختصرات اور تراجم لکھے جاتے تھے، رہا ان کتابوں کے پہلوی ترجموں کا وجود جیسا کہ اس سے قبل فنرش (Wenrich) نے گمان کیا تھا اور جس کی طرف عربی اور ایرانی تراجم نے بھی اشارہ کیا ہے، تو یہ ایسا مفروضہ ہے جس کی کافی وثائق سے تائید نہیں ہوتی"[۱]

سال بھر بعد ۱۹۳۳ء میں اسی رسالہ میں پروفیسر پول کراؤس (Paul Kraus.) نے اس مقالہ پر "حول ابن المقفع" کے عنوان سے اپنا تبصرہ شائع کیا، یہ تبصرہ دو حصوں میں منقسم تھا، پہلا حصہ "ابن المقفع کی جانب منسوب ارسطاطالیسی تراجم" کی بحث پر مشتمل ہے، اس حصے کو ایک مصری اہل قلم ڈاکٹر عبد الرحمٰن بدوی نے، دوسرے مستشرقین کے مقالات کے ساتھ عربی میں ترجمہ کر کے ۱۹۴۰ء میں "التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیۃ" کے عنوان سے شائع کیا، میرے پیش نظر یہی عربی ترجمہ ہے،[۲] اس مقالہ میں پروفیسر پول کراؤس نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ قدیم ارسطاطالیسی تراجم بعد کے اسلامی مورخین کی غلطی سے ابن المقفع کی جانب منسوب ہو گئے ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے جوزیہ فرلانی (G. Furlani) کی کتاب کے خصوصیت سے حوالے دیے ہیں جس میں موخر الذکر نے ارسطاطالیسی منطق کے قدیم ترین ترجمے کے ایک مخطوطہ کا تعارف کرایا ہے، جو بیروت کے سینٹ جوزف کالج میں کچھ عرصے پیشتر دریافت ہوا تھا، عام تاریخی مصادر کے علاوہ جو عربی و سریانی نیز مختلف یورپین زبانوں میں ہیں، پروفیسر موصوف نے فرلانی کی محولہ بالا کتاب کے اور خصوصیت سے اصل ترجمے کے ان اقتباسات کو سامنے رکھا ہے، جو اس نے (فرلانی نے) اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں،

بہرکیف اس مقالہ میں جو ایک جرمن مستشرق کے روایتی تبحر علمی کا آئینہ دار ہے، پروفیسر موصوف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع کا مبینہ منطقی ترجمہ اور اسی طرح بیروت کا یہ مخطوطہ عبد اللہ بن المقفع

---

[۱] التراث الیونانی فی الحضارۃ الاسلامیہ لدکتور عبد الرحمٰن البدوی ص ۱۰۱، آئندہ اختصار کے لیے اس کتاب کا حوالہ التراث الیونانی کے نام سے دیا جائیگا [۲] اس کا اردو ترجمہ مارچ کے معارف میں شائع ہو چکا ہے،

کا ترجمہ کیا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس کے بیٹے محمد بن عبد اللہ بن المقفع کا ترجمہ کیا ہوا ہے، اور یہ ترجمہ موخر الذکر

نے پہلوی زبان سے نہیں کیا تھا، بلکہ براہ راست سریانی یا غالباً یونانی سے کیا تھا،

بیروت کے مخطوطہ کے آخر میں ایک توقیع ہے، اس میں دو اور ترجموں کا ذکر ہے، ایک ابو نوح

کاتب نصرانی کا اور دوسرا سلمہ[1] صاحب بیت الحکمۃ کا، پروفیسر مذکور کا خیال ہے کہ

۱۔ اصل مخطوطہ محمد بن عبد اللہ بن المقفع کا ترجمہ کیا ہوا ہے جس نے اسے المہدی (۱۵۸-۱۶۹ھ)

یا الہادی (۱۶۹-۱۷۰ھ) کے زمانہ میں یحییٰ بن خالد البرمکی کے لیے کیا تھا،

۲۔ دوسرا ترجمہ جسے ابو نوح الکاتب النصرانی نے کیا تھا، وہ ہارون الرشید (۱۷۰-۱۹۳ھ)

کے عہد خلافت میں ہوا،

۳۔ تیسرا ترجمہ جسے سلم (سلما) صاحب بیت الحکمۃ نے کیا تھا، وہ اس نے بہت عرصے بعد مامون

الرشید (۱۹۸-۲۱۸ھ) کے عہد خلافت میں کیا،

میں جرمن مستشرقین کے تبحر علمی کا معترف ہوں، اس کے ساتھ عرب مورخین کے ساتھ بھی مجھے

کورانہ عقیدت نہیں ہے، لیکن فاضل پروفیسر کے ساتھ حسن عقیدت کے باوجود میں کسی طرح خود کو

ان کا ہمنوا نہ بنا سکا، سطور ذیل میں میں نے اپنے وجوہ اختلاف کو پیش کیا ہے،

(۱) منطق کے قدیم ترین مترجم کی شخصیت

منطق کے ساتھ مسلمان حکماء و فضلاء کو شروع ہی سے خاص شغف رہا ہے، چنانچہ جوں ہی اسلامی تاریخ میں علوم و فنون کی باقاعدہ تدوین شروع ہوئی، پہلے ارسطاطالیسی منطق کے ترجمے، اور بعد میں مستقل کتابیں ظہور میں آنے لگیں،

علوم و فنون کی باقاعدہ تالیف و تصنیف کا سلسلہ عباسی خلافت کے آغاز سے شروع ہوتا ہے، پہلے دو خلفاء کا ابتدائی زمانہ اندرونی شورشوں کے دبانے اور عباسی حکومت کے استحکام میں گذرا، نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کے قتل کے بعد ۱۴۵ھ میں ابو جعفر منصور کو اطمینان

[1] مخطوطہ میں اسی طرح "سلمہ" لکھا ہے لیکن غالباً صحیح سلما ہے، دیکھیے الفہرست لابن الندیم (مصری اڈیشن) ص ۳۳۹۔ میرے پیش نظر مصری اڈیشن ہے، اس لیے آئندہ اسی کے صفحات کا حوالہ دیا جائے گا۔

سانس لینے کا موقع ملا، منصور خود بھی علم و ہنر کا قدردان تھا، اور ہر قوم کے حوصلے بھی بلند تھے۔ اساطین علماء، دینیات کی اور اہل ادب لسانیات کی کتابوں کی تالیف و تصنیف میں مشغول تھے، اس کی تفصیل تاریخ التشریع الاسلامی اور تاریخ الادب العربی کے مورخوں کا منصب ہے، غالباً اس کا آغاز اموی دور ہی سے ہو چکا تھا، لیکن اپنے پیشروؤں کے برخلاف عباسی خلفاء نے یونان و ایران کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی بھی ہمت افزائی کی، حالات بھی اس کے سازگار تھے، امویوں نے کسی دینی جذبے یا "عرب کے سوز دروں" کے ماتحت نہیں بلکہ قومی عصبیت کے زیر اثر "عجم کے حسن طبیعت" کو فروغ پذیری کا موقع نہیں دیا، ان کے نوے سالہ دور حکومت میں ایک تنہا مثال خالد بن یزید کی ملتی ہے، جس نے عربی میں یونانی زبانوں کے ترجمے کرائے، ابن الندیم کہتا ہے:

اصطفن القدیم ونقل لخالد بن یزید بن معاویہ کتب الصنعۃ وغیرھا[1]	اصطفن قدیم: اس نے خالد بن معاویہ کے واسطے کیمیا وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے کیے،

لیکن اس ادبی تحریک کے پیچھے کسی علمی سرپرستی کا جذبہ کارفرما نہ تھا، بلکہ حصول دولت کا لالچ کام کر رہا تھا، ابن الندیم آگے چل کر الفہرست میں خالد بن یزید کے متعلق لکھتا ہے،

وھو اول من ترجم لہ کتب الطب والنجوم وکتب الکیمیا وکان جواداً یقال انہ قیل لہ لقد فعلت اکثر شغلک فی طلب الصنعۃ، فقال خالد: ما اطلب بذلک الا ان اغنی اصحابی واخوانی[2]	خالد بن یزید پہلا شخص ہے جس کے لیے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے، وہ بڑا سخی تھا، مشہور ہے کہ اس سے کہا گیا کہ آپ کیمیائی تلاش میں بہت زیادہ سرگرداں رہتے ہیں، تو خالد نے کہا: اس تلاش سے میرا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اپنے ساتھیوں اور بھائیوں کو غنی بنا دوں،

[1] الفہرست ص ۴۳۴ [2] ایضاً ص ۴۹۷

لیکن عباسی خلافت کا آغاز ایک انقلابی تبدیلی کا پیش خیمہ ہے، یہ محض حکمران خاندانوں کی تبدیلی ہی نہیں تھی، بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا، "عرب کے سوز دروں" پر "عجم کے حسن طبیعت" کے غلبہ کا آغاز تھا، اس ثقافتی انقلاب کے نتیجے میں ملکی سرپرستی کے اندر غیر اسلامی و غیر عربی علوم کے ساتھ باقاعدہ اہتمام و اعتنا شروع ہوا، اور ابوجعفر منصور ہی کے عہد خلافت میں منطق کی کتابوں کا پہلی بار عربی میں ترجمہ ہوا، یہی نہیں بلکہ کلینی کی حسب ذیل روایت سے جو انھوں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ[1] سے کی ہے، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری صدی کے نصف اول سے پیشتر ہی تعلیم یافتہ طبقہ میں منطق کے ساتھ شغف اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ ائمۂ دین کو انھیں اس کے خلاف متنبہ کرنا پڑا،

ان الناس لا یزال بھم المنطق حتی	لوگ منطق میں مشغول ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ
یتکلموا فی اللہ فاذا سمعتم ذالک	ذات باری تعالیٰ کے باب میں قیل و قال کرنے
فقولوا لا الہ الا الواحد الذی	لگتے ہیں، پس جب تم اسکو سنو تو کہو نہیں کوئی
لیس کمثلہ شیء[2]	معبود اس اکیلے خدا کے سوا جسکے مانند کوئی چیز نہیں

بہرکیف ارسطاطالیسی منطق کی متداول کتابوں[3] کا ترجمہ ابوجعفر منصور کے عہد میں شروع ہوا اور جس شخص نے اس کی بنیاد ڈالی وہ حسب تصریح قاضی ابو القاسم صاعد اندلسی (المتوفی سنہ ۴۶۲ھ) مشہور کاتب عبد اللہ بن المقفع تھا، وہ طبقات الامم میں لکھتے ہیں،

فاما المنطق فاول من اشتھر بہ	رہا منطق تو جو شخص سب سے پہلے اس (کے ترجمے)
فی ھذہ الدولۃ عبد اللہ بن المقفع	کے لیے اس حکومت (خلافت عباسیہ) میں

۱؎ امام جعفر صادق کا سال وفات ۱۴۸ھ ہے ۲؎ اصول الکافی (مطبوعہ بمبئی) ص ۲۵ ۳؎ پانچویں صدی عیسوی سے آٹھویں صدی تک منطق ارسطو کی آٹھ کتابوں میں صرف تین کتابیں یعنی قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا پڑھائی جاتی تھیں، ان سے پہلے فرفوریوس کی ایساغوجی پڑھائی جاتی تھی۔

الخطیب الفارسی کاتب ابی جعفر	مشہور ہے، وہ عبد اللہ بن المقفع تھا جو مشہور
المنصور، فانہ ترجم کتب ارسطاطالیس	ایرانی خطیب، اور ابی جعفر منصور کا کاتب تھا۔
المنطقیۃ الثلاثۃ التی فی صورۃ	چنانچہ اس نے ارسطاطالیس کی منطق کی کتابوں
المنطق وھی کتاب قاطیغوریاس	میں سے تین کتابوں کا جو منطق کی صورت
وکتاب باری ارمینیاس وکتاب	(Formal logic) کے باب میں
انولوطیقا۔ وذکر انہ لم یترجم	ہیں ترجمہ کیا یعنی کتاب قاطیغوریاس (کتاب
منہ الی وقتہ الا الکتاب الاول	المقولات) کتاب باری ارمینیاس (کتاب
فقط۔ وترجم کذلک المدخل	العبارۃ) اور کتاب انالوطیقا (کتاب التحلیل)
الی کتاب المنطق المعروف	کا، اور کہا گیا ہے کہ اس کے زمانہ تک ان کتابوں
بایساغوجی لفرفوریوس	میں سے سوا پہلی کتاب کے اور کوئی کتاب ترجمہ
الصوری وعبر عما ترجم من	نہیں ہوئی، اور اسی طرح اس نے کتب منطق
ذلک بعبارۃ سھلۃ قریبۃ المأخذ	کے مقدمہ کو جو فرفوریوس صوری کے
. . . .	"ایساغوجی" کے نام سے مشہور ہے ترجمہ کیا
. . . .	اور ان میں سے جس کتاب کا بھی ترجمہ کیا،
. . . .	سلیس اور قریب الماخذ عبارت میں کیا،

اسی طرح قفطی نے "اخبار الحکما باخبار الحکما" میں لکھا ہے:

عبد اللہ بن المقفع کان فاضلاً	عبد اللہ بن المقفع فاضل و کامل تھا، وہ ملت
کاملاً وھو اول من اعتنی فی	اسلامیہ میں پہلا شخص ہے جس نے ابی جعفر منصور

۱؎ طبقات الامم ص ۴۹،

السلسلة الاسلامية بترجمة الكتب	کے لیے منطق کی کتابوں کے ترجمے کی طرف توجہ کی،
المنطقية لابي جعفر المنصور	وہ ایرانی النسل تھا، اسکے الفاظ حکیمانہ ہیں اور
وهو فارسي النسب الفاظه حكيمة	اس کے مقاصد خلل اور کوتاہیوں سے پاک ہیں،
ومقاصده من الخلل سليمة ترجم	اس نے ارسطو کی منطق کی تین کتابوں کا یعنی
كتب ارسطوطاليس المنطقية	کتاب قاطیغوریاس، کتاب باری ارمینیاس
الثلاثة وهي كتاب قاطيغورياس	اور کتاب انالوطیقا کا ترجمہ کیا، یہ ترجمہ
وكتاب باري ارمينياس وكتاب	سلیس اور قریب الماخذ عبارت میں کیا،
انالوطيقا ترجم ذلك بعبارة	. . . .
سهلة قريبة الماخذ[1]	. . . .

اسی طرح ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں لکھا ہے:

وكان عبد الله بن المقفع الخطيب	عبد اللہ بن المقفع بھی ایرانی خطیب تھا، وہ
فارسيا ايضا وكان كاتب ابي جعفر	ابی جعفر المنصور کا کاتب تھا، اس نے ارسطو
المنصور وترجم ايضا من كتب	کی کتابوں میں سے کتاب قاطیغوریاس،
ارسطوطاليس كتاب قاطيغورياس	کتاب باری ارمینیاس اور
وكتاب باري ارمينياس وكتاب انالوطيقا	کتاب انالوطیقا کا ترجمہ کیا تھا، اور اسکے
وترجم مع ذلك المدخل الى كتب	ساتھ منطق کی کتابوں کے مقدمے کا بھی جو
المنطق المعروف بايساغوجي لفرفوريوس	فرفوریوس الصوری کی ایساغوجی کے نام
الصوري وعبارته في الترجمة عبارة سهلة	مشہور ہے، اس کے ترجمے کی عبارت سلیس

۱؎ اخبار العلماء باخبار الحکماء (مصری ایڈیشن) ص ۱۴۸ - ۱۴۹

سهلة قريبة الماخذ[1]	اور قریب الماخذ ہے،

فرانسکو جبرئیلی کے خیال میں عبد اللہ بن المقفع ۱۳۹ھ میں قتل کیا گیا[2]، اور استاذ احمد امین کے خیال میں ۱۴۲ھ یا ۱۴۵ھ میں قتل کیا گیا[3]، اس لیے اگر قاضی صاعد اندلسی اور ابن ابی اصیبعہ کی روایت صحیح ہیں، اور ان پر شک کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو یونانی منطق کی متداول کتابوں کا ترجمہ ۱۳۹ھ یا زیادہ سے زیادہ ۱۴۵ھ سے قبل ہو چکا تھا، اور چونکہ منصور ۱۳۶ھ میں خلیفہ ہوا اور قفطی نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع نے ابی جعفر المنصور کے لیے یہ ترجمہ کیا تھا[4] اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ منطق کی کتابوں کا یہ ترجمہ ۱۳۶ھ و ۱۳۹ھ کے (یا زیادہ سے زیادہ ۱۳۶ھ اور ۱۴۵ھ) کے درمیان ہوا،

لیکن کیا یہ پہلا ترجمہ تھا؟

قاضی صاعد کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودیکہ حکومت کی سرپرستی میں یہ پہلا ترجمہ تھا، لیکن اولیت کا شرف کسی اور مجہول الحال مترجم کو حاصل ہے، جس نے اس سے پہلے بھی "قاطیغوریاس" (کتاب المقولات) کا ترجمہ کیا تھا، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے،

لم يترجم منه الى وقته الا كتاب	عبد اللہ بن المقفع کے زمانے سے پہلے کتاب یعنی
الاول[5]	قاطیغوریاس کے منطق کی کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہوا تھا،

اس طرح ہم فرض کر سکتے ہیں کہ منطق کا ترجمہ ۱۳۶ھ سے پہلے ہی ہونا شروع ہو گیا تھا ممکن ہے دوسری صدی ہجری کے ربع اول میں ہو چکا ہو،

مگر ان افتراضات کے فرض کرنے میں یہ دقت ہے کہ ابن الندیم جو ان تینوں ماخذوں سے

۱؎ عیون الانباء فی طبقات الاطباء، جلد اول ص ۳۰۸ ۲؎ التراث الیونانی ص ۷۔ ۳؎ ضحی الاسلام، الجزء الاول ص ۲۰۵

۴؎ دیکھیے اوپر حاشیہ ۲؎ ۵؎ دیکھیے اوپر حاشیہ

کہیں زیادہ قدیم ہے۔ [الفہرست کا سنہ تالیف ۳۷۷ھ ہے] عبداللہ بن المقفع کے ذکر میں اسکی تصانیف کے ضمن میں ان منطقی کتابوں کے ترجمے کا حوالہ نہیں دیتا[1]۔ حالانکہ اس نے فارسی زبان سے جو کتابیں ترجمہ کی تھیں ان کی تفصیل لکھی ہے، (ص ۱۷۲) یہی نہیں بلکہ پوری "الفہرست" میں اس کے ان تراجم کا ذکر نہیں ہے، مقالۂ سابعہ کے فن اول کے ضمن میں صرف قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس کے ملخص نویسوں کی فہرست میں ابن المقفع (نہ کہ عبداللہ بن المقفع) کا نام ملتا ہے۔ "الکلام علی قاطیغوریاس" کے ضمن میں ابن الندیم کہتا ہے،

"وبهذا الكتاب مختصرات وجوامع مشجرة وغير مشجرة لجماعة منهم: ابن المقفع ....."[2]

اسی طرح: "الکلام علی باری ارمینیاس" کے عنوان کے نیچے لکھتا ہے:

"ومن المختصرات حنين، اسحٰق، ابن المقفع ....."[3]

لیکن "انالوطیقا" کے ضمن میں کسی ملخص نویس کا نام نہیں لیتا،

اسی طرح "اسماء النقلة من اللغات الی اللسان العربی" کے ضمن میں جہاں اس نے یونانی و سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست دی ہے، عبداللہ بن المقفع کا نام نہیں دیا، البتہ "اسماء النقلة من الفارسی الی العربی" کے ضمن میں سب سے پہلے اس کا ذکر کیا ہے[4]، ظاہر ہے کہ منطق کی کتابوں کے تراجم یا تو براہ راست یونانی سے ہوئے یا سریانی سے، جبرئیلی اور پول کراؤس کا خیال ہے کہ یہ تراجم فارسی سے نہیں ہوئے۔ اپنے اس خیال کی تائید میں پروفیسر پول کراؤس نے جاحظ کی مندرجۂ ذیل عبارت کو پیش کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ابن المقفع نے ارسطاطالیس کی منطقی کتابوں کا ترجمہ یونانی زبان سے عربی میں کیا تھا،

فمتی کان رحمہ اللہ تعالی ابن البطریق	پس ابن البطریق، ابن ناعمہ، ابوقرہ، ابن فہر

[1] التراث الیونانی ص ۱۰۳ [2] الفہرست ص ۲۴۸ [3] ایضاً ص ۲۴۹ [4] ایضاً ص ۲۴۴

وابن ناعمہ وابو قرۃ وابن فہر	ابن دہیلی اور ابن المقفع (جو ارسطاطالیسی منطق
وابن دہیلی وابن المقفع مثل	کے مترجمین ہیں) ارسطاطالیس کے برابر کہاں
ارسطاطالیس۔[1]	ہوسکتے ہیں (اسکے مراد متقدمین کو کہنا ہوا کرتے ہیں)

لیکن ان شکوک کا حل ہو سکتا ہے:

پہلا شک یہ ہے کہ عبداللہ بن المقفع کو عموماً فارسی سے عربی میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست میں محسوب کیا جاتا ہے، اس لیے اگر اس نے منطقی کتابوں کا ترجمہ کیا ہوتا تو فارسی سے کیا ہوتا نہ کہ سریانی و یونانی سے، مگر وہ سریانی و یونانی کے مترجمین کی فہرست میں محسوب نہیں ہے، اور جاحظ کی محررۂ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن المقفع نے ان منطقی کتابوں کا ترجمہ یونانی سے عربی میں کیا تھا،

مگر یہ فرض کرنے میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ عبداللہ بن المقفع نے ان کتابوں کا ترجمہ فارسی (پہلوی) سے کیا ہو، عباسی خلفا نے جس طرح ہیئت و نجوم کے ساتھ حسن عقیدت ساسانی حکمرانوں سے ورثہ میں پائی تھی، اسی طرح منطق کی اہمیت بھی وہیں سے حاصل کی تھی، اور قدیم فارسی (پہلوی) میں افلاطون و ارسطو کی کتابیں نقل ہو چکی تھیں، اجتیاس (Agathias) کہتا ہے کہ ارسطو اور افلاطون کی تصانیف خسرو انوشروان کے واسطے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھیں[2] بعثت اسلام سے قبل جندیسا پور کے مدرسہ میں لوگ فارسی زبان ہی میں تفلسف کیا کرتے تھے، اس لیے منطق و فلسفہ کی اہمیت ایران کے تعلیمیافتہ طبقے میں مسلم ہو چکی تھی، اور غالباً اسی وجہ سے بوعلی سینا کو فارسی زبان میں "دانش نامۂ علائی" تصنیف کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ تمام اصطلاحیں قدیم فارسی (پہلوی) میں موجود تھیں، غرض منطق و فلسفہ کی تعلیم ایران کے تعلیمیافتہ طبقے کے خمیر میں گندھی ہوئی تھی۔ عباسی خلافت کے قیام کے بعد (بلکہ اس سے پہلے بھی) یہی ایرانی النسل طبقہ کتابت کے

[1] کتاب الحیوان جلد اول ص ۷۴ [2] التراث الیونانی ص ۱۱۹

عہدوں پر فائز ہوا، اور اس نے ۔ ۔ ۔ جس طرح قدیم عجمی ادب کو عربی زبان میں منتقل کیا، فارسی (پہلوی) زبان جب غیر زبانوں سے جو کتابیں ترجمہ ہوئی تھیں، (مثلاً کلیلہ و دمنہ جسے برزویہ نے سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا) انھیں بھی عربی میں ترجمہ کیا، منطق و فلسفہ کی کتابیں بھی پہلوی میں ترجمہ کی جا چکی تھیں[۱]، اور ان ہی کتابوں کو پڑھ کر عباسی دور کا طبقہ کتاب منطق و فلسفہ میں کتابیں تصنیف کیا کرتا تھا، مثلاً

منصور بن طلحہ بن طاہر ایرانی النسل تھا، مگر اپنے تفلسف کی بنا پر "حکیم آل طاہر" کہلاتا تھا، اور فلسفہ میں اس کی تصانیف مشہور ہیں[۲]۔

سعید بن ہارون ایرانی النسل کاتب تھا، مگر "کتاب الحکمۃ" کا مصنف تھا[۳]،

علی بن عیسیٰ بن داؤد الجراح کے بیٹے ابو القاسم عیسیٰ بن علی کے بارے میں ابن ندیم کہتا ہے:

"اوحد زمانہ فی المنطق والعلوم القدیمۃ"[۴]

اسی طرح قدامہ بن جعفر کے متعلق کہتا ہے:

"وکان قدامہ احد البلغاء الفصحاء والفلاسفۃ الفضلاء وممن یشار الیہ فی علم المنطق"[۵]

یہ سب کاتب تھے، اور ابن الندیم نے انھیں "کتاب" ہی کی فہرست میں ذکر کیا ہے، بایں ہمہ منطق و فلسفہ میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے، حالانکہ فلسفی اور منطقی نہیں تھے، اسی طرح عبد اللہ بن المقفع بھی باوجود پیشہ کے اعتبار سے کاتب ہونے کے منطق سے واقف تھا، اور اس نے منطق کی متداول کتابوں کو پہلوی تراجم سے عربی میں ترجمہ کیا۔

دوسرا شک یہ ہے کہ ابن المقفع "الفہرست لابن الندیم" میں منطق کی پہلی دو کتابوں (قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس) کے ملخص نگاروں میں محسوب ہے، مترجمین و ناقلین میں نہیں۔

اس شک کے تین حل ہو سکتے ہیں،

یا تو لفظی ترجمہ کے بجائے ابن المقفع نے ان کتابوں کا آزاد ترجمہ کیا ہو، اور غیر ضروری تطویل و تفصیل کو نظر انداز کر دیا ہو اور اس طرح اس کے ترجمے میں نقل و ترجمہ کے بجائے اختصار و تلخیص کی شان پیدا ہو گئی ہو جس کی وجہ سے ابن الندیم کو اسے ملخص نویسوں کی فہرست میں لکھنا پڑا۔

یا عبد اللہ بن المقفع سے پہلے کسی اور نے عربی میں ترجمہ کیا ہو، اور اس نے اس کی تلخیص کی ہو، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے،

یا خود ان کتابوں کے پہلوی مترجم ہی نے فارسی (پہلوی) میں ان کا ترجمہ بطور جوامع و مختصرات کے کیا ہو، اور ان ہی جوامع و مختصرات کا ترجمہ عبد اللہ بن المقفع نے عربی میں کیا ہو،

تیسرا شک یہ ہے کہ ابن الندیم نے عبد اللہ بن المقفع کے حال میں[۱] اس کے منطقی تراجم کا ذکر نہیں کیا، اور قاطیغوریاس و باری ارمینیاس کے ملخص نویسوں کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا نام دیا ہے نہ کہ عبد اللہ بن المقفع کا، پروفیسر پول کراؤس نے کہا ہے:

"ابن ندیم کی الفہرست میں ابن المقفع کے بارے میں ایک طویل فصل ہے جس میں مولف نے اس کی زندگی اور تالیفات کو بیان کیا ہے، لیکن اس کی فلسفیانہ تصانیف کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے، ہاں مگر خصوصیت سے یہ کہا ہے کہ فارسی سے ترجمہ کرنے والوں میں ایک ابن المقفع بھی تھے، اور ان مترجمین میں سر فہرست اسی کا نام رکھا ہے[۲] . . . . اور اس سے قبل ہم نے لکھا ہے کہ ابن الندیم نے اس فصل میں جو اس نے عبد اللہ بن المقفع پر لکھی ہے، اس کے یونانی تراجم کے باب میں ایک لفظ بھی نہیں کہا، حالانکہ یہ اہم مسئلہ ایسا نہ تھا جس سے ابن الندیم غفلت برتتا"[۳]

میرے خیال میں یہ شک بالکل بے بنیاد ہے۔ ابن الندیم کی عادت ہے کہ کسی مصنف کا تذکرہ بالاستیعاب ایک جگہ نہیں کرتا، کچھ حصہ ایک جگہ دیتا ہے اور کچھ حصہ دوسری جگہ، مثلاً خالد بن یزید کے یونانی سے عربی میں ترجمہ کرانے کا ذکر دو جگہ کیا ہے، ایک جگہ مترجمین و ناقلین کی فہرست میں کہتا ہے:

اصطفن القدیم ونقل لخالد بن یزید بن معاویہ کتب الصنعۃ وغیرھا[1]

اصطفن قدیم اس نے خالد بن یزید بن معاویہ کے لیے کتب کیمیا وغیرہ کے ترجمے کیے،

دوسری جگہ مقالہ عاشرہ میں "اخبار الکیمیائیین والصنعویین" کے تحت میں اس کے کیمیا کے ساتھ شغف کی پوری تفصیل مع وجوہ واسباب دیتا ہے،[2]

پھر ابن ندیم بھی انسان تھا، اگر قاضی صاعد سے چوک ہو سکتی ہے تو ابن الندیم بھی معصوم نہیں تھا۔ اس سے بھی چوک ہو سکتی ہے، اور یقیناً ہوئی ہے، (اگر اس کا نام چوک ہے) کیونکہ:

ا۔ ہم بالیقین جانتے ہیں کہ ابن المقفع نے (خواہ باپ ہو یا بیٹا) ارسطاطالیسی منطق کی کتب ثلاثہ کا بشمول انالوطیقائے اولیٰ ترجمہ کیا تھا، قاضی صاعد، قفطی اور ابن ابی اصیبعہ تینوں نے انالوطیقا کا نام لیا ہے،[3] بیروت کا نو دریافت مخطوطہ بھی انالوطیقا کے ترجمہ پر مشتمل ہے اور ورق نمبر ۲۰۵ پر صراحۃً لکھا ہوا ہے:

تم کتاب انولوطیقا ولیس بعدہ من ھذہ الکتب الا کتاب انود الطبیعی[4]

مگر ابن الندیم نے "الکلام علی انالوطیقا الاولیٰ" کے تحت میں ابن المقفع کا ذکر کسی عنوان سے نہیں کیا، نہ ناقلین ومترجمین کے سلسلے میں، نہ مفسرین کے، نہ ملخص نویسوں کے۔[5]

ب۔ مخطوطۂ بیروت کی توقیع میں جس تیقن کے ساتھ ابن المقفع کے بعد دو اور مترجمین کا ذکر ہے، اس کے پیش نظر کوئی شک نہیں رہتا کہ ارسطو کی کتب ثلاثہ کا ترجمہ ابو نوح الکاتب النصرانی

[1] الفہرست ص ۳۴۴ [2] الفہرست ص ۴۹۹ [3] دیکھیے اوپر کے حاشیے، [4] التراث الیونانی ص ۱۰۵
[5] الفہرست ص ۳۴۸

اور سلمہ (سلم) صاحب بیت الحکمۃ نے بھی کیا تھا، مخطوطہ کی توقیع حسب ذیل ہے

تمت الکتب الثلاثۃ من ترجمۃ محمد بن عبد اللہ المقفع وقد ترجمھا بعد محمد ابو نوح الکاتب النصرانی ثم ترجمھا بعد ابی نوح سلم الحرانی صاحب بیت الحکمۃ لیحیی بن خالد البرمکی[1]

محمد بن عبد اللہ بن المقفع کی ترجمہ کردہ تینوں کتابیں ختم ہوئیں، اس کے بعد محمد ابو نوح کاتب نصرانی نے ترجمہ کیا، ابو نوح کے بعد سلم حرانی صاحب بیت الحکمۃ نے یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے ترجمہ کیا

مگر ارسطو کی کتب منطقیہ کے ناقلین ومفسرین وغیرہم کی فہرست میں ان دونوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ سلم صاحب بیت الحکمۃ کا مستقلاً ذکر ابن الندیم نے تیسرے مقالے کے دوسرے فن میں کیا ہے،[2] مگر اس کے منطقی تراجم کا ذکر نہیں کیا، یہی نہیں بلکہ اس کی ترجمہ کی خدمات کو فارسی کتابوں کے ترجمے میں منحصر کر دیا ہے۔

وله نقول من الفارسی الی العربی[3]

فارسی سے عربی میں اس کے ترجمے ہیں۔

حالانکہ خود ابن الندیم نے مامون کے وفد (جسے مامون الرشید نے روم سے یونانی علوم کی کتابیں لانے کے واسطے بھیجا تھا) کی جو تفصیل دی ہے اس میں سلم صاحب بیت الحکمۃ کا نام بھی ہے،[4] جس کے معنی یہ ہیں کہ سلم یونانی زبان بھی جانتا تھا، اور یونانی کتابوں کا کامیابی سے ترجمہ کر کے خود کو خلیفہ مامون الرشید کے حسن انتخاب کا مستحق بنا چکا تھا،

ج۔ مسعودی کہتا ہے کہ عبد اللہ بن المقفع نے مانی، ابن دیصان اور مرقیون وغیرہ کی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کی تھیں۔

"کتب مانی وابن دیصان ومرقیون مما نقلہ عبد اللہ بن المقفع وغیرہ و ترجمہ من الفارسیۃ والفہلویۃ الی العربیۃ."[5]

مسعودی ابن الندیم سے زیادہ قدیم ہے اور ساتھ ہی قابل اعتماد بھی، اس لیے یقینی امر ہے کہ عبد اللہ بن المقفع

[1] تراث الیونانی ص ۱۱۳ [2] الفہرست ص ۲۴، [3] الفہرست ۱۴، [4] ایضاً ص ۳۳۹ [5] مسعودی ج ۲ ص ۴۰۱

نے اسی دو زندقہ کی تائید میں متعدد کتابیں لکھی تھیں، اور مانی و ابن دیصان وغیرہ کی کتابوں کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا،[1] با ایں ہمہ الفہرست میں عبد اللہ بن المقفع کی ان ملحدانہ تصانیف کا ذکر تک نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ "الفہرست" ان کتابوں کی فہرست ہے جن کی ابن الندیم کے زمانہ میں مانگ تھی، یا جن سے تعلیم یافتہ طبقہ متعارف تھا، نہ تو ابن الندیم اس التزام کا مدعی ہے کہ اسلامی تاریخ میں جو کتاب لکھی گئی وہ اس کا حال ضرور لکھے گا اور نہ ہمیں اس سے یہ توقع کرنا چاہیے، اس لیے اس استدلال میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے کہ اگر کسی کتاب کا ذکر "الفہرست" میں نہ ہو تو اسکے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے یا کسی واقعہ کا اگر اس میں ذکر نہ ہو تو واقعہ ہوا ہی نہ ہو، پھر جس قسم کے تسامحات پر فاضل پروفیسر نے اپنے استدلال کی بنیاد رکھی ہے، وہ سرے سے تسامحات ہی نہیں، صرف اجمال و تفصیل کی مثالیں ہیں، ایک ہی شخص کا ذکر ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ مفصل۔

چوتھا شک یہ ہے کہ ادیب شہیر عبد اللہ بن المقفع جس نے کلیلہ و دمنہ کا عربی میں ترجمہ کیا وہ اس ابن المقفع سے قطعاً مختلف ہے جس نے ارسطاطالیسی منطق کی کتب ثلثہ کا ترجمہ کیا، چنانچہ پروفیسر موصوف کا کہنا ہے:

"اس صورت میں اس کا بہت زیادہ احتمال ہے کہ اس فصل میں جو اس نے عبد اللہ بن المقفع کے متعلق لکھی ہے، اس چیز کا ذکر نہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ وہ ارسطو کے مترجم اور ادیب مشہور کو ایک شخص نہیں سمجھتا"[2]

پروفیسر صاحب اپنے اس شبہہ کو زیادہ زوردار بنانے کے لیے آگے فرماتے ہیں:

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ارسطو کی دو کتابوں (قاطیغوریاس اور باری ارمینیاس) کے مترجمین کی فہرست میں صرف "ابن المقفع" کا ذکر کرتا ہے، نہ کہ "عبد اللہ بن المقفع" کا"[3]

[1] چنانچہ ابن خلکان نے مہدی کا قول نقل کیا ہے "ما وجدت کتاب زندقة الا واصله ابن المقفع" [2] التراث الیونانی ص ۱۰۵ [3] ایضاً

اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں،

اس لیے ہمارے واسطے یہ فرض کرنا ضروری ہے کہ ہمارے سامنے دو مختلف شخص ہیں جو شاید آپس میں رشتہ دار تھے، اور ہر ایک "المقفع" کے عجیب غریب نام سے موسوم تھا، جو انکا خاندانی نام ہے"[1]

لیکن یہ مفروضہ بوجوہ ذیل ناقابل تسلیم ہے:-

ا۔ ہر چند کہ عبد اللہ بن المقفع کی کنیت ابو محمد تھی، اور غالباً اس کا ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام "محمد" تھا، مگر اس "محمد بن عبد اللہ بن المقفع" کے حالاتِ زندگی سے ہم قطعاً ناآشنا ہیں، خود فاضل پروفیسر کو اعتراف ہے کہ

"چنانچہ الفہرست (ص ۱۱۸) میں ہے کہ اسلام لانے سے قبل اس کی کنیت ابو عمرو تھی اور بعد میں ابو محمد ہوئی اور ابن خلکان نے صراحۃً اس کے بیٹے محمد کا ذکر کیا ہے، البتہ ہم اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے"[2]

اس لیے جب ہمیں اس کی زندگی کے متعلق کچھ معلوم ہی نہیں تو اس قیاس آرائی کا حق کس طرح ہو سکتا ہے کہ

"اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ اس کا بیٹا ہوگا، جس نے خلیفہ منصور المتوفی ۱۵۸ھ کی خدمت کی تھی"[3]

بالخصوص جب ثقہ مورخین کی تصریحات اس رائے کی تردید کر رہی ہوں،

ب۔ یہ یقینی ہے کہ کسی "ابن المقفع" نے ارسطاطالیسی منطق کی کچھ کتابوں کا ترجمہ کیا تھا، ابن الندیم کے علاوہ جس کا سال وفات غالباً ۳۸۵ھ ہے، الجاحظ بھی، جس کا سال وفات ۲۵۵ھ ہے کہتا ہے،

نعتی کان رحمه الله تعالی ابن البطریق وابن ناعمه وابوقره وابن فهر وابن وهیلی وابن المقفع مثل ارسطاطالیس"[4]

[1] التراث الیونانی ص ۱۰۵ [2] ایضاً ص ۱۰۷ [3] ایضاً ص ۱۰۷ [4] کتاب الحیوان جلد اول ص ۳۸

اب الجاحظ سے سنیے کہ اس ابن المقفع کا مصداق کون ہے

وفی کتاب کلیلہ ودمنہ وکن کالنسر	کتاب کلیلہ ودمنہ میں ہے کہ ایسے گدھ کی طرح بن
حولہ الجیف ولاتکن کالجیف حولہا	جس کے چاروں طرف مردار ہو اور وہ مردار نہ بن
النسور، فاعترض علی ترجمۃ ابن المقفع	جس کے چاروں طرف گدھ ہوں۔ ابن المقفع
بعض المتکلفین من فتیان الکتاب	کے اس ترجمہ پر نوجوان کاتبوں میں سے بعض تکلف
فقال انما کان ینبغی ان یقول....[۵]	کرنے والوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ یوں کہنا چاہئے تھا۔۔۔

یعنی ابن المقفع وہی شخص ہے جو کلیلہ ودمنہ کا مترجم ہے۔ بالفاظ دیگر ارسطا طالیسی منطق کا مترجم ابن المقفع اور کلیلہ ودمنہ کا مترجم ابن المقفع شخص واحد ہیں۔

(باقی)

ایران کے کتابخانے

از

جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب لکھنؤ یونیورسٹی

"ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر نذیر احمد صاحب گذشتہ سال ایران گئے تھے، کئی مہینہ وہاں قیام رہا۔ ناظرین معارف کے لئے وہ بہت سے علمی تحفے ساتھ لائے ہیں، جو بالاقساط آپ کی خدمت میں پیش ہوتے رہیں گے، پہلی قسط میں کتابخانۂ مجلس شورای ملی تہران کے نوادر پیش کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ اہل علم اس سے مستفید و مسرور ہوں گے" م

ایران کے مختلف حصوں میں چھوٹے بڑے شخصی و قومی کتابخانے پائے جاتے ہیں، لیکن اُن میں بیشتر ایسے ہیں جن کی باقاعدہ فہرستیں نہیں ہیں، اس لئے اُن سے استفادہ مشکل ہے، ہو سکتا ہے اصفہان اور شیراز میں مجھے کوئی قابل ذکر خطی کتابوں کا کتابخانہ نہیں ملا، البتہ مشہد میں آستانۂ قدس رضوی کا کتابخانہ نہایت ہی قابل قدر اور اہم ہے، اس میں نوادر بڑی تعداد میں ہیں، تبریز میں بھی اچھے کتابخانے ہیں مگر بدقسمتی سے مجھے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ تہران میں حسب ذیل اہم کتابخانے ہیں،

۱۔ کتابخانۂ مجلس شورائے ملی،

۲۔ کتابخانۂ مدرسۂ سپہ سالار و دانشکدۂ معقول و منقول،

۳۔ کتابخانۂ آقائے مشکوٰۃ

۴۔ کتابخانۂ ملی ملک متصل مسجد شاہ واقع محلہ بازار،

۵ - کتابخانۂ دانشگاہ،

۶ - کتابخانۂ دانشکدۂ ادبیات،

۷ - کتابخانۂ ملی،

ان میں سے پہلے تین کتابخانوں کی مفصل فہرستیں شائع ہوگئی ہیں، اس لئے ان سے استفادہ آسان ہے، چوتھے کی قلمی فہرست موجود ہے جس کے مطالعہ کا پورا موقع ملا، اس لئے اس کے خصوصیات کی تفصیل بیان کیجائیگی، آستانۂ قدس رضوی (مشہد) کے کتابخانے کی مکمل فہرست پانچ جلدون میں شائع ہو چکی ہے، اس لئے اس کتابخانے کا تعارف کرانے مین بھی دشواری نہ ہوگی، باقی کتابخانون کے متعلق کچھ لکھنا نہایت دشوار ہے، اس لئے پانچ کتابخانوں کے حالات بالاقساط پیش کئے جائین گے،

کتابخانۂ مجلس شوریٰ | اس کتابخانے کا تعلق مجلس شوریٰ سے ہے، اور وہ مجلس ہی کی عمارت کے ایک حصے میں واقع ہے، کتابخانے کی اجمالی تاریخ یہ ہے کہ جب دنون جنگ بین الملکی کی وجہ سے مجلس شورائے ملی ایرن کے کام معطل تھے، دو تین اہم اشخاص نے جو سیاست کے ساتھ علم و فرہنگ مین دستگاہ رکھتے تھے، مرحوم تخیر و شاہ زادہ رخ (جو کاخ بہارستان کے منتظم اور وہان کے امور کے متکفل تھے) نے مل کر یہ تجویز پیش کی کہ مجلس کے لئے ایک کتابخانہ قائم کیا جائے، اور اس کام کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ آقائے تقوی رئیس دل دیوان کشور کی رہنمائی مین حکیم مرزا ابوالحسن جلوہ کے کتابخانے کی دو سو جلدین خریدی گئین، اس کے بعد خبیر سلطنت آقائے مہدی علی ہدایت کے توسط سے تقریباً ایک ہزار جلدین اعتصام السلطنت کے کتابخانے سے خریدی گئیں، ۱۳۰۲ھ مین کتابخانہ کا باقاعدہ قیام عمل مین آیا، ۱۳۰۵ھ مین اس کی ایک فہرست شائع ہوئی جس مین ۳۰۰۵ مطبوعہ اور ۲۰۰ قلمی نسخے تھے، دس سال کے عرصہ یعنی ۱۳۱۱ھ مین کتابون کی تعداد تقریباً بارہ ہزار ہوگئی جن مین ۲۰۰۰ نسخے قلمی کتابوں کے تھے، بہمن ماہ ۱۳۱۱ ہجری شمسی مین یوسف اعتصامی رئیس کتابخانہ (اعتصام الملک) نے ایک مفصل فہرست شائع کی، جو ۵۰۰ صفحون پر مشتمل تھی،

اس میں ۲۰۰ قلمی نسخوں کا کسی قدر تفصیلی بیان تھا، اس فہرست میں جلد اول کی ۲۱۷ قلمی کتابین بھی شامل تھیں، اس طرح اگرچہ یہ دوسری فہرست ہے، مگر قلمی نسخون کی پہلی فہرست ہوئی، اس فہرست مین حسب ذیل ۲۴ عنوان قائم تھے،

مضامین	نسخے	طب	۴۰
ادعیہ و اذکار	۱۲	سیر و مناقب و تراجم احوال	۳۴
احادیث و اخبار	۱۵	اخلاق و نصائح و مواعظ	۲۷
فقہ	۱۷	مجامیع	۵۳
تفسیر	۲۸	عرفان و تصوف	۳۱
کلام	۲۳	حکایات	۹
حکمت و فلسفہ	۴۳	جغرافیا	۷
ریاضی و نجوم و ہندسہ	۶۰	سفرنامہ	۱۲
تاریخ	۹۲	معرفۃ الاحجار و حیوان شناسی	۸
ادبیات	۳۳	ردود	۴
صرف و نحو و معانی و بیان	۱۱	صناعت	۲۳
دواوین و تذکرہ	۱۳۹	رقعات	۱۱
لغت	۳۱	کتب مختلفہ	۲۹

۱۳۱۷ھ شمسی میں آقائے ابراہیم شریفی رئیس کتابخانہ کی کوشش سے صرف فارسی کی خطی کتابون کی ایک دوسری فہرست شائع ہوئی، جو فہرست اول سے مفصل اور فنی اصول پر مرتب کی گئی تھی، اس کے مرتب ابن یوسف شیرازی کا یہ کارنامہ قابل یادگار ہے، یہ تالیف ۱۵۰ صفحون پر مشتمل ہے، جس مین حسب ذیل

سات عنوان ہیں، آخر میں ۴ عنوانون کے ماتحت ایک انڈکس ہے، جو ۱۱۰ صفحوں پر مشتمل ہے، آخری عنوان ان تمام کتابوں کا حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، جس کا اس فہرست میں تعارف کرایا گیا ہے،

۱- تفسیر وکتب راجعہ بقرآن کریم	تا صفحہ	۴۲
۲- ادعیہ واذکار	"	۵۶
۳- احادیث واخبار	"	۶۴
۴- فقہ	"	۷۸
۵- لغت	"	۱۲۲
۶- بدیع، عروض، قافیہ، نحو، صرف، معانی وغیرہ	"	۱۳۸
۷- اشعار وتذکرہا ودیوانہا	"	۷۰۸

اس کتابخانے کی تیسری فہرست بھی تیار ہو چکی ہے جس کی ترتیب آقاے طباطبائی کے ہاتھوں عمل میں آئی ہے، مگر اس کے چھپنے کی نوبت اب تک نہیں آسکی ہے۔

ذیل میں چند کتابون کا تعارف کرایا جاتا ہے،

فہرست اول | نمبر ۶۶ (ص ۳۰) رسالہ **علم تجوید** (فارسی) تالیف احمد بن حسین از اولاد بریر بن خضر ہمدانی، اس میں بارہ باب ہیں، اور اوراق ۳۱۔ تاریخ کتابت سنہ ۷۵۲ھ

۶۹ (ص ۳۲) **کتاب الغرائب والعجائب** (عربی)، تفسیر قرآن تالیف تاج القراء ابو القاسم محمود بن حمزہ بن نصر، تالیف سنہ ۵۲۱ھ، کتابت سنہ ۹۲۰ھ مگر منقول عنہ سنہ ۶۷۳ھ کا نسخہ تھا، اوراق ۳۱۳،

۷۰ (ص ۳۳) **الکشاف عن حقائق التنزیل** (عربی) مجلد اول وثانی مشہور مفسر جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر زمخشری کی تفسیر (۴۶۷ – ۵۳۸ھ) اوراق ۵۹۳، سنہ کتابت ۸۶۳ھ کاتب عبدالرحمن

ابن محمد بن السباک الحنفی نہایت عمدہ اور نفیس نسخہ ہے، اس کو سلطان محمد بن مراد خان (سلطان ترکی) نے خضر بن الفقیہ الیاس کو ہدیہ دیا تھا، جو بعد میں خضر کے لڑکے لطف اللہ کے پاس تھا، اول ورق پر اس کی تفصیل درج ہے، ان سطروں کے نیچے یہ عبارت ہے،

"ہذا المجلد قد انتقل الیّ مع المجلد الثانی بالشراء الشرعی بعد وفات المرحوم لطف اللہ المسطور من اختہ نفیسۃ بوکالۃ ابراہیم بن المرحوم ( ) ابن الشیخ جواد الذی کان مدرساً فی اسلامبول صینہا عن اللہ بلد الجذری بالف درہم عثمانی .... وانا الفقیر محمد علی الدنوتر دار توماں تحریراً فی الیوم الخامس من شعبان سنہ ثمان وسبعمائۃ"

مگر تاریخ تملک یعنی سنہ ۷۰۸ھ غلط ہے کیونکہ مجلد دوم کے آخر میں سنہ کتابت سنہ ۸۶۳ھ صراحتہ درج ہے،

۷۱- **الکشاف** (عربی) (ص ۳۴) تعداد اوراق ۳۱۰، مجلد چہارم، تاریخ کتابت سنہ ۶۶۶ھ،

"شہر رمضان سنۃ ست وستین وستمائۃ علی ید الفقیر الی اللہ تعالیٰ ...... الحسین بن العجمی الحلبی،

۷۲- **الکشاف** (ص ۳۴) مجلد اول۔ تعداد اوراق ۳۲۲۔ تاریخ کتابت سنہ ۷۲۰ھ۔

تمت المجلدۃ الاولیٰ...... یوم الثلثاء السابع وعشرین من ربیع الآخر الواقع فی المورخ لعشرین وسبعمائۃ علی ید العبد الضعیف الراجی رحمۃ ربہ اللطیف الحسن بن محمد بن علی بن اسفندیار الطبری ایک جگہ اور ہے۔ فرغ من تحشیۃ المحتاج الی اللہ الحسن بن محمد عصر یوم السبت لسبع بقین من جمادی الاولیٰ الواقعۃ فی عشرین

وسبعمایة"

۷۵ - المختار من کتاب الاخبار (فارسی) } "شرح و ترجمہ قرآن مشتمل بر شانزدہ سورہ از فاتحہ تا النحل" بہت نفیس و اہم نسخہ ہے، شارح و مفسر کا نام معلوم نہیں،

طرز تحریر کا اندازہ اس مثال سے ہو سکے گا،

"واذ قلنا للملائکة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس ابی و استکبر وکان من الکافرین .... آوردہ اند کہ ابلیس وقتی بآدم رسید و گفت اے آدم بدانکہ ترا روے سپید دادند و مرا سیاہ، غرہ مشو کہ مثال ما ہمچنان ست کہ باغبانی درختی بادام نشاند در باغ و بادام برآید .... آن بادام را ببرند و بفروشند، یکے را مشتری خداوند شادی باشد آن را با شکر بیامیزد یکے را مشتری خداوند مصیبت آن بادام را سیاہ کند و بر سر تابوت ریزد اکنون تو آنی و ما این اما باید کی دانی کی باغبان یکے است و آب از یک جوی خوردہ ایم ذوالنون مصری گفت در بادیہ بودم ابلیس را دیدم کی چہل روز سر بسجود نہادہ بود کہ برداشت گفتم اے مسکین بعد از بیزاری و لعنت این ہمہ عبادت چیست گفت اے ذوالنون اگر من از بندگی معزولم او از خداوندی معزول نیست سہل عبداللہ تستری گفت ابلیس را در بادیہ دیدم گفتم چرا سجود نکردی گفت اے سہل بگذار مرا اگر ت بحضرت راہی باشد بگو ست چون این بیچارہ نمی خواہی بہانہ بردی چہ نہی اے سہل ہمیں ساعت بر سر خاک ادم بودم بزہ بار سجدہ بردم و خاک قبر وی بر دیدہ نہادم عاقبت ندا شنیدم کہ لا تتعب فلستا نوید لک"۔ کتابت ۷۰۰ھ اور ۸۰۰ھ کے درمیان ہوئی ہوگی،

۷۸ - مفاتیح الاسرار و مصابیح الابرار (عربی ص ۲۹) } تفسیر قرآن، تصنیف ابو الفتح محمد بن عبد الکریم شہرستانی صاحب کتاب الملل والنحل و نہایة الاقدام وغیرہ،

شہرستانی کی تالیفوں میں اس کتاب کا نام نہیں ملتا "از قراریکہ در پشت صفحہ اول از خط مصنف نقل شدہ شہرستانی در سنہ ۵۳۸ھ این تفسیر ابتدا کردہ است، این کتاب فقط مخصوص شرح سورة الفاتحہ والبقرہ است" تاریخ کتابت ۶۶۶ھ۔ کاتب محمد بن محمد زنجانی، ابراہیم بن محمد بن المؤید ابو المجامع الحموی الجوینی کے لئے یہ نسخہ لکھا گیا، اوراق = ۳۲۴۔

۹۳ - شرح طوالع الانوار (عربی ص ۴۶) } طوالع الانوار مؤلفہ قاضی بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) کی شرح۔ شارح کا نام معلوم نہیں ہوا، سنہ کتابت ۷۴۴ھ۔ اوراق = ۱۷۰،

۱۰۳ - مطالع الانظار (عربی - ص ۵۷) } شرح طوالع۔ شارح ابو الثنا شمس الدین محمود بن عبد الرحمن بن احمد اصفہانی نے ابو المعالی محمد بن السلطان سیف الدین ابو الفتح قلاؤن کے لئے لکھی تھی، اوراق = ۲۱۴، تاریخ کتابت ۷۳۵ھ

۱۱۱ - التحصیل (عربی ص ۵۹) منطق و طبعیات میں ابو الحسن بہمنیار بن مرزبان آذربائجانی شاگرد ابن سینا صاحب کتاب مراتب الموجودات و کتاب البہجة والسعادة کی تصنیف ابو الحسن بیہقی نے تتمہ صوان الحکمة میں اس کا ذکر کیا ہے، اس میں تین حصے ہیں، حصہ اول منطق میں اور باقی دو حصے مابعد الطبیعہ وغیرہ پر مشتمل ہے، اوراق = ۱۵۲

۱۱۲ - ترجمہ مجمل الحکمة (فارسی ص ۵۷) ترجمہ خلاصہ رسائل اخوان الصفا، بفارسی از رسالہ اول ارثماطیقی تا باب ۱۳ در سبب پدید آمدن معدنیات تاریخ کتابت ۶۶۶ھ اوراق ۱۴۰۰، اخوان الصفا کا ایک فارسی ترجمہ ۹۰۸ھ کا لکھا ہوا شمارہ ۱۰۴ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

۱۱۴ - التلویحات (عربی ص ۸۰) منطق و طبعیات میں تالیف شہاب الدین سہروردی (مقتول ۵۸۷ھ) وفات کے ۲۲ سال بعد کا نسخہ (نوشتہ بتاریخ ۶۰۹ھ در بلدہ [illegible] ملیہ روم)

بہت اہم ہے، اوراق = ۱۵۰

۱۷۰ - الجمع بین رأیی (افلاطون و ارسطو) (عربی ص ۵۹)
مقالہ محمد بن محمد بن طرخان ابو نصر فارابی متوفی ۳۳۹ھ، قفطی نے تاریخ الحکماء میں اس تالیف کا ذکر کیا ہے، نسخہ ناتمام عدۂ اوراق = ۶۴

۱۷۳ - الشفاء (عربی ص ۷۲)
ابن سینا کی "شفا" کا نہایت اہم نسخہ ہے، اس کا کاتب علی بن فتح اللہ المعروف [illegible] الاصفہانی الشہیر بالصابری ہے، سنہ کتابت ۱۰۱۱ھ اوراق = ۴۷۱

۱۷۹ - ارشاد استرلاب (فارسی - ص ۸۰)
تالیف ناصر الدین، محمد بن محمد شیرازی، ۵۰ باب ہیں، اوراق ۳۹ - نہایت قدیم نسخہ ہے، تاریخ کتابت ۷۷۳ھ

۱۵۱ - استیعاب الوجوہ الممکنۃ فی صنعۃ الاسطرلاب (عربی ص ۸۱)
تالیف ابو ریحان بیرونی، مشتمل بر جلد اول و دو دائرہ، اس کے ساتھ ایک اور کتاب منہج الطلاب فی عمل الاسطرلاب شامل ہے، جس کا مؤلف ملک اشرف عمر بن ملک مظفر یوسف بن عمر، سلطان یمن [illegible] ابراہیم بن [illegible] الموصلی جو اس فن کا استاد تھا، اس نے اس کتاب پر تقریظ لکھی تھی، (۶۹۵ھ میں)، تاریخ کتابت ۸۳۸ھ اوراق = ۴۴۱،

۱۷۰ - رسائل در احکام نجوم (عربی ص ۹۴)
ادوار کواکب و بروج و اختیارات و استخراج کے بارے میں، تالیف احمد بن محمد بن عبد الجلیل سجزی، محمد بن قزوینی نے حواشی چہار مقالہ میں اس کے نسخوں کی تفصیل دی ہے، (ص ۱۹۹-۲۰۱) اوراق ۱-۱۱۹، اس میں [illegible]

۱۸۱ - زیج (فارسی ص ۹۰)
اول اور آخر سے ناقص ہے، مؤلف کا نام معلوم نہیں، لیکن جداول اوساط کواکب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جدول اول سال ۴۶۰ھ یزدگردی (۶۲۹ھ)۔

سے متعلق ہیں، آخر کتاب کے حاشیہ میں طبرک کے مراصد کے بارے میں یہ عبارت پڑھی جاتی ہے "از آلات رصد فخر دولہ ...... در ری کہ در رصد فرمودہ بشت کوہ طبرک را صد خانہ [illegible] خضر خجندی" تا [illegible] خضر خجندی ابو محمود منجم فخر الدولہ دیلمی کا معاصر ہے، جس نے آلت رصدی "سدس فخری" کو اس کے نام سے اختراع کیا تھا،

۱۸۳ - زیج جامع سعیدی (فارسی ص ۱۰۰)
در تنقیح زیج ایلخانی خواجہ نصیر الدین طوسی، تالیف رکن الدین بن شرف الدین حسینی آملی - مؤلف اس طرح لکھتا ہے،

"چون بعد از مراجعت سفر ہندوستان در دار السلطنت ہرات از تصنیف بنجاہ باب سلطانی در کلیات اصول و معرفت اصطرلاب فارغ شدہ و بپایہ سریر سلطنت حضرت یافت امیرزادۂ اعظم اعدل ابو القاسم بابر بہادر خان خلد اللہ تعالی ملکہ گذرانیدم و بعد از عنایت و مرحمت بسیار اجازت نمودیم بجانب سمرقند و حکایت رصد جدید در میان آمد"

یہ زیج سلطانی ابو سعید گورگان کے نام پر ۸۶۳ھ میں مرتب ہوئی ہے، تاریخ کتابت ۹۴۳ھ اوراق = ۳۹ -

۱۸۴ - الزیج السلطانی (فارسی ص ۱۰۱)
یہ زیج یا تو قطب الدین شیرازی متوفی ۷۱۰ھ یا شمس الدین بخارائی کی تالیف ہے، یہ نسخہ بہت قدیم ہے، اوراق ۴۴۳،

۱۸۷ - سر الاسرار فی حقیقۃ التیسیر کیفیۃ الاستمرار (عربی ص ۱۰۴)
تالیف ابو القاسم علی بن احمد [illegible] معاصر سلطان محمود، اس کتاب کا موضوع نجوم سلطان محمود غزنوی سے متعلق ہے، اگرچہ اس نسخہ پر کتابت کی تاریخ درج نہیں ہے، پھر بھی اہم نسخہ ہے اوراق = ۱۱۹ -

۱۹۴ - شرح الملخص (عربی ص ۱۰۶)
"الملخص فی الہیئت" کا مؤلف محمود جغمینی خوارزمی ہے، قاضی زادہ رومی اور مولوی عبد الحکیم نے اس کی شرح کی ہے، زیر بحث شرح کا مؤلف محمد بن محمد [illegible]

طبیب ہی جس نے اپنے قلم سے یہ نسخہ قاضی القضاۃ کے لئے لکھا تھا، تاریخ تالیف ششتہ اور تاریخ اتمام شرح وتحریر ۲۲ ششتہ بہت اہم نسخہ ہے، اوراق ۲۰۰۔

۱۹۲ - صورالکواکب (فارسی ص ۱۰۷) مشہور منجم ابوالحسین عبدالرحمٰن بن عمر صوفی رازی (۲۹۱ ۳۷۶) کی تالیف صورالکواکب ہے، زیر نظر کتاب اسی کا ترجمہ ہے جس کو مترجم نے اپنے بعض دوستوں کے اصرار سے فارسی کا جامہ پہنایا تھا، تاریخ کتابت ششتہ عدد اوراق ۲۱۲

۲۰۲ - کیہان شناخت (فارسی ص ۱۱۲) علم ہیئت کا اہم ترین رسالہ عین الزمان ابوعلی حسن بن علی قطان مروزی (۴۶۵ - ۵۴۸ھ) کی تالیف ہے، مؤلف رشید الدین وطواط کا ہم عصر تھا، سبب تالیف کے سلسلہ میں لکھتا ہے،

"چون گرایش مردمان بہ ستارہ شناختن کہ اورا علم نجوم گویند پیوستہ دیدم و بسیار دوی بتہ دیدم وکتابہائے کہ استادان ایں دانش ساختہ اند، از بہر نو آموزان...... بسیار دیدم سخن دراز و زیادت از اندازہ فہم نو آموزان در یابد سخن کوتاہ و کم ازان کہ بندہ باشد این چند سخن فراز آوردم کوتاہ و آسان تا چون کسی خواہد کہ ازین ہنر بہرہ گیرد این مایہ را آسان تواند دریافتن"

ابوالحسن بیہقی نے تتمہ صوان الحکمۃ میں اور سیوطی نے طبقات اللغویین والنحاۃ میں مؤلف کے تفصیلی حالات کے ساتھ اس کتاب کا ذکر کیا ہے، "کیہان شناخت" تین فصلوں پر مشتمل ہے، فصل اول در بیان احوال عالم علوی، فصل دوم در بیان عالم سفلی، اور فصل سوم در گذشتن روزگار،"

تاریخ تالیف ششتہ تاریخ کتابت نسخہ اصل ۶۰۷ و تاریخ نقل این نسخہ ۱۳۲۲ھ اوراق ۷۷، اس نسخہ کی عبارت قابل غور ہے،

"کتاب کیہان شناخت لخزانۃ کتب الامیر الاسفہسالار الاجل الکبیر العالم العادل المؤید المظفر المنصور حسام الدولۃ والدین رکن الاسلام والمسلمین ...... الملوک والسلاطین سید الامراء ابی الحسن علی بن عمر بن علی اطال اللہ بقاءہ"

۲۱۰ - مجموعہ (عربی ص ۱۱۸) تین کتابوں پر مشتمل از مؤلفات محی الدین یحییٰ بن محمد بن ابی الشکر مغربی اندلسی (۱) المدخل مفید (۲) غنیۃ المستفید فی الحکم علی الموالید (۳) تحویل سنی العالم نہایت قدیم نسخہ ہے، عدد اوراق ۱۰۹،

۲۱۷ - اکبرنامہ (فارسی ص ۱۲۲) ابوالفضل کے اکبرنامہ کا اچھا نسخہ ہے، تاریخ کتابت ۱۰۲۳ھ، اوراق ۴۱۳،

۲۵۶ - روضۃ الطاہرین (فارسی ص ۱۴۲) عام تاریخ ہے، جو ابتدا سے لیکر صفویہ تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس کے مؤلف طاہر بن محمد حسین سبزواری نے اکبرشاہ کے نام معنون کیا ہے، نسخہ نا تمام اوراق ۵۱۲،

۲۷۸ - الامالی (عربی ص ۱۵۰) امالی املیہ کی جمع ہے اور لغت میں اقوال اور بیانات مختصر کے معانی میں آتا ہے لیکن اصطلاح ادب میں ایسے مباحث و مسائل کو کہتے ہیں، جن کو کوئی بڑا متبحر عالم بیان کرتا ہے، اور حاضرین مجلس بغیر کمی بیشی کے اس کو لکھ لیتے ہیں، زیر نظر نسخہ امالی علم الہدیٰ سید مرتضیٰ ابوالقاسم علی بن الحسین الموسوی (متوفی ۴۳۶ھ) پر مشتمل ہے، یہ نسخہ نہایت قدیم ہے، کتابت کا سنہ ۵۴۲ھ درج ہے، حیدر بن بختیار بن الحسین الشنبتی نے سنہ ۵۴۲ھ کے ماہ صفر میں اس کو لکھا تھا،

۲۸۰ - ترجمہ کشکول (فارسی ص ۱۵۹) احمد شہید عاملی نے سلطان ابو عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے شیخ بہائی کے کشکول کو فارسی میں منتقل کیا تھا، تاریخ کتابت ۱۰۸۰ھ اوراق ۱۸۶،

۲۰۱ - التمثیل والمحاضرہ (ص ۱۵۹) تالیف ابو منصور ثعالبی (۳۵۰ - ۴۲۹) صاحب یتیمۃ الدہر

وغیرہ اس میں یہ فصلیں ہیں (۱) در محل و نمونہ کتاب (۲) در اقوال طبقات مردم (۳) چیزہاے کہ عاقبا بانہا تمثیل می شود (۴) در فنون و اغراض، یہ کتاب شمس المعالی قابوس وشمگیر کے نام لکھی گئی، تاریخ کتابت ۸۸۴ھ، ورق ۴۴

۲۹۴ - **کتاب الصید والقنص** (عربی ص ۱۶۹) فن شکار پر ایک اہم تالیف ہے، مگر اس کے مؤلف کا تعین نہ ہوسکا، آغاز:

"الحمد للہ الذی انشأ الموجودات بحکمتہ واخترع الاشیاء بقدرتہ خلق السموات والارض واللیل والنہار" الخ

صفحہ اول مجدد ہے، کتاب کرم خوردہ اور ۱۶ باب پر مشتمل ہے، ایک جگہ معتضد باللہ خلیفہ عباسی کے شیر سے جنگ شکار کو نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف المعتضد باللہ عباسی (۲۷۹-۲۸۹ھ) کا معاصر ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف ابوبکر محمد بن یحییٰ صولی شطرنجی (متوفی ۳۳۶ھ) ادیب مشہور کا معاصر تھا،

یہ نسخہ شوال ۸۸۸ھ ہجری میں لکھا گیا، خط نسخ آمیختہ بہ ثلث ہے، کل اوراق کی تعداد ۱۴۴ ہے، نہایت نفیس اور قابل مطالعہ ہے،

[illegible] - **نجعۃ البلاغہ** (عربی ص ۱۰۶) فصیح جملوں اور بلیغ کلموں کے مترادفات سے متعلق ہے، مؤلف کا نام معلوم نہیں، ایک نایاب وقدیم نسخہ ہے، اس موضوع پر جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب سے متقدم ہے، اور شاید سب کی بنیاد اسی کتاب پر ہو گی، مثلاً عبدالرحمن بن عیسیٰ بن حماد ہمدانی کی تالیف الالفاظ الکتابیۃ، ابن سکیت کی کتاب الالفاظ المترادفۃ و تہذیب الالفاظ، ثعالبی کی فقہ اللغۃ اور شیخ ابراہیم یازجی کی نجعۃ الرائد فی المترادف والمتوارد، اس کتاب میں ۱۶ فصلیں [illegible] ہیں،

(۱) حث العقل وضدہ (۲) حث المنطق (۳) حث الاسماء والرفقۃ والاخلاق (۴) حث المال والرغبۃ فیہ (۵) حث العطاء والاستعطاء (۶) حث الحرب وارباہا (۷) حث المودۃ وانواعہا (۸) حث الحسن والقبح والشباب والشیب (۹) حث القرابۃ وشرف الابوۃ (۱۰) حث المطعوم (۱۱) حث النکاح والطلاق (۱۲) حث المشی والمفاوز (۱۳) حث التقوی والزہد (۱۴) حث السماء (۱۵) حث الحیوان (۱۶) حث فنون مختلفہ،

نسخہ کا پہلا حصہ غائب ہے، دوسرا صفحہ اس طرح شروع ہوتا ہے:-

"بغیر انتخبتہا وما انتہیت الیہ من اعلام خبرا تصبتہا وجمعتہا او ما وجدت فی کلام البلغاء من لفظ یعد فی السحر الحلال والعذب الزلال" الخ "حث العقل" اس طرح شروع ہوتی ہے کہ

"عقل وجول ومعقول وحجی ونہی وحصاۃ واصاۃ"

یہ نسخہ ذی الحجہ ۵۵۶ھ کا تحریر ہے، اوراق ۱۵۶۔

۳۱۹ - **الکافیۃ النحویۃ** (عربی ص ۱۰۵) علم نحو کا یہ مختصر رسالہ جو المقدمۃ الکافیۃ فی النحو و کافیۃ ذوی الادب فی علوم کلام العرب کے نام سے بھی موسوم ہے جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر مالکی معروف بابن حاجب متوفی ۶۴۶ھ کی تصنیف ہے، جس پر متعدد متبحر علماء نے شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں، زیر نظر نسخہ بہت نفیس اور اپنی قدامت و تذہیب وغیرہ کے لحاظ سے بے نظیر ہے، اس کا کاتب یاقوت مستعصمی ہے، اور سنہ کتابت ۶۹۰ھ، اوراق ۴۲

۳۲۰ - **المصباح** (عربی ص ۱۰۷) در علم معانی و بیان، شرح سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) بر قسمت سوم کتاب مفتاح العلوم سراج الدین سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) تاریخ

تالیف ۹۲۴ھ، تاریخ کتابت ۹۲۷ھ،

۲۱۹ - تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی (فارسی - ص ۱۹۱) | جنفرت کے بروفن یہ کتاب ۸۹۲ھ میں لکھی گئی لیکن اس نسخہ پر سال کتابت ۸۹۲ھ ہجری درج ہے، بہر حال

نہایت قدیم و اہم نسخہ ہے۔

۲۲۰ - تیمور نامۂ ہاتفی (فارسی ص ۱۹۲) | ہاتفی کی وفات ۹۲۷ھ میں ہوئی اور یہ نسخہ ۹۵۶ھ کا ہے، کہ ایک دوسرا نسخہ دوسری جلد میں بشمارہ ۵-و بیان ہوا ہے

۲۲۲ - خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار (فارسی ص ۱۹۵) میر تقی الدین محمد بن شرف الدین علی حسینی کاشانی کا اہم تذکرہ کا نہایت عمدہ نسخہ جو مصنف کی حیات ہی میں

۱۰۰۰ھ میں لکھا گیا، در اصل نسخہ بذا خاتمہ خلاصۃ الاشعار کے جزو اول پر مشتمل ہے یعنی اس حصہ کی ... میں صرف ۱۷ فصلین اس میں ہیں، اوراق ۶۱۴، (باقی)

جلوۂ صد رنگ

(جناب حبیب احمد صاحب صدیقی سکریٹری اتر پردیش گورنمنٹ کا مجموعۂ کلام)

اس میں مصنف کا اگست ۱۹۴۰ء تک کا سارا کلام تاریخ وار دیا گیا ہے۔ پہلے غزلیات ہیں جن کی تعداد ... ہے، اس کے بعد نظمیں ہیں، پہلی نظم گاندھی جی کی وفات پر ہے، پھر متفرق اشعار ہیں، اور ہر شعر حسن و عشق کی ایک مستقل روداد ہے،

پتہ

دار المصنفین اعظم گڈھ

"منیجر"

اسلامی تصوف کا نظری اور عملی پہلو

از جناب گوپی چند صاحب نارنگ ایم اے

اسلامی تصوف در اصل قلب و روح کے تزکیہ اور اخلاص فی العمل کا نام ہے، اس حیثیت سے وہ شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ اس کی ظاہری تعمیل کے ساتھ اس کی معنوی تکمیل ہی کا نام تصوف ہے، اس کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ سب زوائد یا کیفیات ہیں، اس مضمون میں مضمون نگار نے دونوں کو خلط ملط کر دیا ہے، اور اسلامی تصوف کے اصلی ترجمان شیخ ابو نصر سراج، شیخ علی ہجویری، شیخ ابو القاسم قشیری، شیخ شہاب الدین سہروردی اور امام غزالی وغیرہ کی تصانیف کے بجائے سید امیر علی، ڈاکٹر عابد حسین، مارگریٹ اسمتھ، نکلسن اور تارا چند کی کتابوں سے اسلامی تصوف کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی اصلی شکل نظر نہیں آسکتی، تاہم وہ بھی ایک مسلک کا ترجمان ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

دنیا کے تقریباً ہر مذہب میں وجدانی اور ماورائی رجحان کم و بیش ضرور پایا جاتا ہے لیکن نسل اور افراد کی خصوصیات کی بنا پر اس رجحان کا رنگ ہر جگہ جدا ہے کہیں یہ عنصر مذہب کی تہوں میں پنہاں ہے اور کہیں نمایاں، اسلامی تصوف کی انفرادی شان یہ ہے کہ اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے یہ بذات خود ایک مکمل اور باضابطہ نظام مذہب ہے۔

اسلامی تصوف سے مراد وہ ریاضت اور مجاہدات ہیں، جو قلب کے پردے ہٹائیں اور حقائق کا انکشاف کر دیں، اس کی ابتدا زہد و تقویٰ سے ہوئی، اس زمانے میں قرآن کے ظاہری معنوں پر زور دیا جاتا تھا، اور شریعت کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی، رفتہ رفتہ کچھ بیرونی اثرات سے اور

بھی نئے تہذیبی اور تاریخی تقاضوں کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جو قرآن کے مخفی معنوں پر زور دیتے ہوئے اس کی تاویل نئے ڈھنگ سے کرنے لگا، یہ لوگ ایک طرف شرعی پابندیوں کے، اور دوسری طرف عقلی دلائل کے خلاف تھے[۱] اور مذہب کا سرچشمہ قلب و روح کو قرار دینے لگے۔" باطنیت کے اس بڑھتے ہوئے رجحان نے خدا کی ماورائیت کے تصور سے ملکر بہت جلد سے اسلام کو اپنے رنگ میں رنگ لیا، اسلام کی اسی بنیادی خصوصیت کو تصوف کہا جاتا ہے، تصوف نے اسلام کی دینی، عقلی اور شعوری تالیف میں خاص حصہ لیا ہے، مشرق میں اسلامی تصوف کے سب سے بڑے نمایندے امام غزالی (ف ۱۱۱۱ء) اور مغرب میں ابن طفیل[۲] (ف ۱۱۸۵ء) کو مانا جاتا ہے،

تصوف مسلمانوں کے نزدیک مذہب کے باطنی پہلو کا نام ہے، مذہب کے اصول خصوصاً "توحید الٰہی" کو تقلیداً اور اعتقاداً قبول کرنا عام لوگوں کے لیے کافی ہے، لیکن جو لوگ روحانی تکمیل کے خواہش مند ہیں، وہ اس مرحلے سے آگے بڑھ کر اس منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں، جہاں توحید کا تصور ان کے لیے بدیہی مشاہدہ اور قلبی واردات بن جائے[۳]

اس منزل تک پہنچنے کے لیے جو لائحہ عمل مرتب کیا گیا ہے، اس کی بنیاد ان چار اصولوں پر رکھی گئی ہے[۴]

(۱) حقیقت کے راز کو عقل کی مدد سے نہیں جان سکتے، صداقت کی تلاش کے لیے عقلی علم بے کار ہے، اس کے لیے مخصوص علم چاہیے، جو منطق یا ریاضی کے اصولوں سے نہیں، بلکہ حسِ باطنی یا وجدان کے ذریعہ ممکن ہے،

۱؎ امیر علی Spirit of Islam ۲؎ معارف: ابن طفیل تو فلسفی تھا، مغرب میں تصوف کے سب سے بڑے نمایندے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی ہیں ۳؎ ڈاکٹر عابد حسین، ہندوستانی قومیت ص ۲۰۱

(۲) انسان اشرف المخلوقات ہے، وہ اگر باطن کی طرف رجوع کرے تو اسے احساس ہوگا کہ اس حقیقت کو جاننے کی تڑپ ہے، یہ وہ چنگاری ہے، جو "ابدی شعلہ" میں ضم ہوجانا چاہتی ہے، اس کا سراغ قلب میں ملتا ہے، اس لیے صوفی کو قلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے، یہی وہ مقام ہے جہاں دیدارِ محبوب سے چشم باطن روشن ہوسکتی ہے،

(۳) معرفت کے لیے ریاضت اور مجاہدہ ضروری ہے، خود غرضی، لذتیت اور عیش کوشی سے روح ملوث ہو جاتی ہے، مادی لذتوں کے قید و بند سے آزاد ہو کر ہی حقیقت کو بے حجاب دیکھ سکتے ہیں،

(۴) خدا سے تعلق حب الٰہی کی بنا پر ہونا چاہیے، محبت ایک جذبہ ہے، اور معرفت کیفیت ہے، جذبہ سے کیفیت تک ایک قدم ہے، محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد محبوب کے جلوہ حسن میں جذب ہو کر خود کو فراموش کر جاتا ہے، حب الٰہی صوفی کا ضابطہ ہے، وجدان اس کا مدعا ہے، اور معرفت اس کا منتہا ہے، بقول ہجویری محبت معرفت کی طرف لیجاتی ہے، اور معرفت وصال محبوب ہے،[۱]

نظری پہلو صوفیوں کے مختلف گروہ اور سلسلے ہیں، اور ان سب کے اپنے اپنے جداگانہ نظام ہیں جو ایک دوسرے سے کم و بیش مختلف ہیں، لیکن مقصد سب کا ایک ہی یعنی قلبی واردات کے ذریعے خدائے واحد کی معرفت حاصل کرنا، بعض گروہوں میں اختلاف کی بنا پر تعریف توحید کا مسئلہ ہے، اس مسئلہ میں دو نظریے ہیں: وحدتِ وجود، اور وحدتِ شہود، تصوف میں روحانی تکمیل کی معراج وہ مقام ہے جہاں طالب مشاہدۂ حق میں اس قدر محو ہوتا ہے کہ اسے اپنی انفرادیت کا احساس نہیں رہتا، یہاں شاہد و مشہود کی دوئی مٹ جاتی ہے، اور صرف شہود ہی شہود باقی رہ جاتا ہے، یہاں تک دونوں میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف اس کیفیت یا حال کی تعبیر سے پیدا ہوتا ہے

۱؎ Medieval Islam, Grunebaum ص ۱۳۵

یعنی اسے تصورات کے ذریعے سمجھانے یا الفاظ کے ذریعے ظاہر کرنے کے دو مختلف نظریے ہیں، پہلے گروہ کے صوفیہ اس احساس وحدت کو حقیقی سمجھ کر اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وجود در حقیقت ایک ہی ہے، یعنی ذات باری تعالیٰ کا، اس کے سوا جو کچھ بھی نظر آتا ہے، مثلاً انسان اور کل کائنات، وہ کچھ بھی نہیں اور ہی وجود مطلق کی محدود صورتوں کی نمود ہے... محدود کا تعینات کی قید سے آزاد ہو کر مطلق میں محو ہو جانا، جو سمجھ نمود انفرادی کی فنا اور وجود حقیقی کی بقا ہے، زندگی کا اعلیٰ مقصد اور صوفی کی جد و جہد کا منتہا سمجھا جاتا ہے[1]،

لیکن دوسرے گروہ کا بیان ہے کہ "شہود کی وحدت، وجود کی وحدت پر دلالت نہیں کرتی، اس میں شک نہیں کہ صوفی کو اجتماع خیال یا افراط محبت کی وجہ سے مشاہدے کے وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاہد و مشہود میں وجود کا فرق مٹ گیا ہے، مگر یہ مقام قلب، معرفت کی آخری منزل نہیں بلکہ درمیانی منزل ہے، جو لوگ اس سے آگے بڑھنے میں کامیاب ہوتے ہیں ان پر یہ حقیقت کھلتی ہے، کہ انسان اور خدا کا اتحاد وجودی نہیں بلکہ نسبتی ہے، خدا بہ حیثیت خالق کے مخلوق سے جدا ہے، گو اپنے آپ کو مخلوق کے اندر ظاہر کرتا ہے، جیسے مصور اپنی ذات کو تصویر میں، یا شاعر شعر میں، خالق کا وجود حقیقی ہے، مخلوق کا اضافی، انسان کی انتہائی ترقی راہ معرفت میں یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے اتنا قریب ہو جائے کہ فصل کا احساس نہ رہے، مگر خدا سے حقیقی وصل یعنی اتحاد ذات اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا[2]،

ان میں سے پہلا نظریہ ہمہ اوست اور دوسرا ہمہ از اوست کہلاتا ہے، بقول ڈاکٹر عابد حسین ہمہ از اوست کو مذہب شریعت کے تصورات اور واقعیت پسندانہ نقطۂ نظر سے قریب تر ہے، جبکہ ہمہ اوست یعنی وحدت وجود کا نظریہ شعر کے تخیل اور عوام کے روحانی جذبہ کو زیادہ تر متاثر کرتا ہے، اور اسی بنا پر کل عالم اسلام خصوصاً ایران اور ہندوستان میں زیادہ مقبول رہا ہے اور اب تک مقبول ہے[3]۔

[1] ڈاکٹر عابد حسین ص ۲۰۳ [2] ایضاً ۲۰۴ [3] ایضاً

بعض انتہا پسند صوفی روح کے خدا میں ضم ہو جانے کے قائل بھی ہیں، تصوف کی زبان میں اسے حلول یا اتحاد کہتے ہیں، اس کے سب سے بڑے ترجمان منصور تھے لیکن شیخ سراج اور امام غزالی اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تصوف میں وصل اور وصلت کے الفاظ محض خدائی قرب کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں، فنا فی اللہ کا بھی یہ مطلب نہیں کہ روح ہستی مطلق میں ضم ہو جاتی ہے، غزالی کا بیان ہے کہ شاہدۂ حق کے وقت روح حکم ربی سے عالم ملکوت سے برآمد ہوتی ہے، اور جسمانی وجود سے الگ ہو کر اصل منبع کی طرف رجوع کرتی ہے، انا للہ و انا الیہ راجعون کا بھی یہی مطلب ہے[1]۔

عملی پہلو | تصوف کے نظری پہلو کی طرح اس کا عملی پہلو بھی کافی اہمیت رکھتا ہے، تصوف کے مبتدی کے لیے جن مقامات سے گذرنا لازمی ہے وہ یہ ہیں: (۱) توبہ (۲) ورع (۳) زہد (۴) فقر (۵) صبر (۶) توکل (۷) رضا۔ ایسے ہی صوفی کے لیے بھی مندرجۂ ذیل حال ضروری ہیں: (۱) مراقبہ (۲) قرب (۳) محبت (۴) خوف (۵) رجا (۶) شوق (۷) انس (۸) اطمینان (۹) مشاہدہ، اور (۱۰) یقین ہے[2]،

توبہ سے مشاہدہ تک صوفی کے سفر کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں، اتباع شریعت، معرفت اور فنا[3]، پہلی حالت کو مجاہدہ دوسری کو محاضرہ اور تیسری کو مشاہدہ بھی کہا جاتا ہے[4]،

صوفی کا ضابطۂ ذکر ہے، اس میں عبادت کے وہ طریقے بھی شامل ہیں جن سے وجد لانے میں مدد ملتی ہے، ذکر دو قسم کے ہیں، خفی اور جلی، ذکر میں ایک منزل ایسی آتی ہے جب طالب کا تعلق صرف نفس سے رہ جاتا ہے، جو اس کے اشیاء مٹ جاتے ہیں،

[1] نکلسن Studies in Islamic Mysticism ص ۸۳ [2] ڈاکٹر تاراچند Influence ص ۸۰ [3] مارگریٹ سمتھ ۲۰۰/ Islam ص ۸۰ [4] امیر علی Spirit of Islam ص ۸۳

اور باطن کی سماعت بیدار ہو جاتی ہے، اب زبان حال سے ذکر الٰہی کی ضرورت نہیں رہتی، خفی طور پر ذکر اندر ہی اندر جاری رہتا ہے، یہاں تک طالب دین و دنیا سے بے خبر ہو جاتا ہے، قلب کی آنکھ کھلتی ہے، اور احقاق حق ہونے لگتا ہے، اس کے بعد طالب بیداری کے عالم میں وہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے، جو محویت کے عالم میں ممکن نہیں، اس منزل پر پہنچکر جو مشاہدہ ہوتا ہے، وہی حقایق علیا کا مشاہدہ کہلاتا ہے،

پیر یا شیخ کی ذات تصوف میں ایک رکن کی حیثیت رکھتی ہے، اس ہستی کے گرد صوفیوں کے سلسلے اور نظام بڑھتے اور پھیلتے رہے ہیں، پیر کے بغیر روحانی تکمیل ممکن ہی نہیں، وہ اپنے مریدوں کا اخلاقی اور روحانی رہنما ہے، ہر پیر اپنے سلسلہ میں حکمران کا مرتبہ رکھتا ہے، وہ عموماً صاحب حال اور کشف و کرامات ہوتا ہے، ان صفات کی بنا پر اسے خلیفۂ خدا بھی کہا جاتا ہے، صوفی پر واجب ہے کہ خدا سے بھی زیادہ اپنے پیر کا فرمانبردار ہو،[1] کیونکہ معرفت حق کی کڑی منزلیں بغیر اس کی اعانت اور رہنمائی کے طے نہیں ہو سکتی،

تصوف اسلام کی قوتِ ارتقا کا ضامن ہے، اس کا رخ کائنات کی طرف ہے، اسلام میں اب تصوف کا وہ اگلا ساز ور نہیں، پھر بھی مسلمانوں کے موجودہ مذہبی احساس کا تعلق نظریۂ وحدت وجود سے کافی گہرا ہے۔[2]

---

[1] ذاکر نامہ ص ۱۰ [2] پروفیسر وان Medieval Islam. ص ۱۳۸

شعر العجم حصہ پنجم

(مؤلفہ مولانا شبلیؒ)

شعر العجم کا پانچواں حصہ ہے، اس میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، (جامع مولانا سید سلیمان ندوی)

منیجر

آثارِ علمیہ

مکاتیب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

شاہ معین الدین احمد ندوی

گذشتہ نمبروں میں جو خطوط شائع ہوئے ہیں، وہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے آخری زمانے کے تھے، مگر بعض حیثیتوں سے اہم تھے، اس لیے ان کو پہلے شائع کر دیا گیا، اب ابتدا سے سلسلہ وار شائع ہوں گے۔ ' م '

(۱۴)

دیسنہ

برادر عزیز ادام اللہ سعدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ، کارڈ ملا، الحمد للہ مع الخیر ہوں، خربوزوں سے تو ہم لوگ قطعاً محروم ہیں اس لیے اس کا ذکر ہی بے سود ہے، آم البتہ ہیں، مگر بہت کم ہیں، تاہم قابلِ شکر ہیں، ہٹھوا ہمارے ہاں آیا، اور اچھا آیا، باقی سب تھوڑے تھوڑے، ہٹھوا ہی پر ابھی تک گذارا ہے، آج کچھ دسہری اور سپیدے اور لنگڑے کے ٹوٹنے کی امید ہے، ثمر بہشت کے دانے اچھے آئے ہیں، مگر افسوس کہ پدر بزرگوار اوّل کی طرح مجھے اس "ثمر بہشت" سے محروم رہنا پڑے گا، یعنی اس سے پہلے ہی بہشت زار دیسنہ سے نکلنا پڑے گا،

شذرات میں غبار خاطر میں چند باتیں کھٹکتی ہیں، اصلاح کر دیجیے،

(۱) "زاغ و زغن" نکال دیجیے،

(۲) "سعی و محنت سے نہیں، بلکہ عطاء الوہیت ہے" کی جگہ "عطاء و موہبت سے ہے" بنا دیجیے،

(۳) اظہار و بیان کی فراوانی کی جگہ قوت اظہار و بیان کی فراوانی کر دیجیے،

اب یہاں سے نکلنے کو پر تول رہا ہوں، سلیم کو بلایا ہے، اس کا انتظار ہے، کہیں جانے سے پہلے ایک دو روز کے لیے وہاں آنا چاہتا ہوں،

نماز کی نماز میں مسجد جانا آموں کی کثرت خورش سے تکلیف دہ ہوتا ہے، تاہم بفضلہ تعالیٰ یہ تکلیف برداشت کیجاتی ہے، ورنہ آم خوردن چہ ضرور، بقیہ اوقات میں بحمد اللہ چلنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے، والسلام

سید سلیمان، ۳۰ر جون ۱۹۴۶ء

(۱۵)

بذریعہ مشیر المہام تعلیمات
بھوپال

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

الحمد للہ خیریت ہے، معارف کے شذرات جاتے ہیں، اب آپ لوگ خود شذرات لکھکر مجھے بھیجیں، میں دو دو چار مہینے دیکھتا رہوں گا، پھر آپ لکھتے رہیں، تاکہ یہ بار کی ذمہ داری میرے سر سے ہٹے، لہذا اس کا خیال رکھیے،

یہاں سرکاری مہمان خانہ میں ہوں، بہترین موسم، بہترین منظر اور بڑا خوش آیند مستقبل ہے، مگر خدا جانتا ہے کہ ان سب سے بہتر شبلی منزل میری نگاہ میں ہے، اے کاش کہ مجھے وہاں سکون میسر آتا، اور خدمت مزاج حالات سے میں بچا رہ سکتا، وہاں کا فقر یہاں کی شاہی سے بہتر ہے،

حب الوطن از ملک سلیماں خوشتر — خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد — می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

ایک ہزار تنخواہ، سواری کا الاؤنس اور پانچ سو ماہوار سلسلۂ دار التصنیف کے لیے اور تمام وفائد دمحاکم شرعیہ اور تعلیمات شرقی کی امارت، اس جاہ و اعزاز سے دل میں ذرحت ہے اور نہ قلب میں انشراح، استاذ مرحوم نے اخیر زندگی میں مولانا حمید الدین صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا،

مرا گر تو بگذاری اے نفس طامع — بسے بادشاہی کنم در گدائی

بحمد اللہ تعالیٰ و بفضلہ طمع نفس سے خالی ہوں، مگر دل بعض کاموں کو چاہتا ہے، جن میں سے ایک دار التکمیل کا خیال ہے، جو مجھے یہاں لے آیا ہے، یہاں کے مدارس کی حالت اچھی نہیں، روپیہ کی کمی نہیں، مگر آدمیوں کی سخت کمی ہے، باہر سے چند آدمی شاید آ جائیں تو کچھ کام چلے،

اب آپ لوگ دار المصنفین کو اپنی زندگی کا کام سمجھکر استقلال کے ساتھ قائم رہیا اور یہ سمجھیں کہ عنقریب یہ ذمہ داری آپ صاحبوں ہی پر عائد ہوگی، اور بزرگوں کی اس امانت کو آپ ہی لوگوں کو قائم رکھنا ہے۔

کبھی کبھی خط تو لکھیں، دیکھیے معارف کا پایہ گرنے نہ پائے اور بھرتی کے مضامین اسمیں جگہ نہ پائیں، اڈیٹر کو نظم ہو یا نثر اس کے ایک ایک حرف کو دیکھنا چاہیے، تصحیح و اصلاح اور کتابت ہر ایک کی نگرانی کرنی چاہیے،

اس وقت یہاں موسم بہت فرحت انگیز ہے، گرمی اور امس جو ہندوستان میں اس موسم کے برکات ہیں یہاں نام کو نہیں، مچھر نہیں، البتہ دن کو آبادی میں مکھیاں ہوتی ہیں،

میرے لیے شہر میں ایک بڑا مکان صاف ہو رہا ہے، خوش منظر ہے، مگر دل اپنے ویرانہ ہی کو چاہتا ہے،

والسلام

سید سلیمان، ۲ر جولائی ۱۹۴۶ء

(۱۶)

بھوپال

برادر عزیز حماک اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا خط اور مضمون فتح افغانستان پہنچ گیا، دیکھوں گا، الحمد للہ خیریت ہے، معارف اس دفعہ اچھا نکل گیا ہے، گو اغلاط ہیں، سرمد کی عبارت شاید آپ نے درست کر دی ہے، بہت اچھا کیا، اور اچھا ہوا، البتہ اس نمبر میں صرف مقالات ہی ہیں، یاست صاحب سے کہدیجئے کہ وہ استفسارات لکھا کریں کہ تنوع رہے۔

صباح الدین صاحب کا خط آیا ہے، اپنے آپریشن کی بابت مشورہ پوچھا ہے، مشورہ مشکل ہے، میں لکھتا ہوں کہ یہاں چلے آئیں، یہاں سے پونہ قریب ہے، جہاں یہ آپریشن ہوتا ہے، اور یہاں کا موسم رانچی ہی کے قریب قریب ہے،

مولوی وحید الرحمٰن[1] صاحب کا خط آیا ہے، ان کے مطالعہ کی بھی رہبری کیجئے، میں بھی ان کے خط کا جواب لکھ رہا ہوں،

ضرورت ہے کہ آپ تاریخ کے کوچہ سے اپنا قدم باہر نکالیں، اور دوسرے فنون کی طرف توجہ کریں،

۱۶ جولائی سے میں نے دار القضا اور مدارس عربیہ کا چارج لے لیا، دار القضا میں زیادہ تر مقدمات نکاح، طلاق، خلع و تفریق اور ولایت اور کبھی کبھی قصاص کے ہوتے ہیں،

[1] معارف: ایک زیر تربیت رفیق۔

مدارس کی حالت بہت خراب ہے، دین اور مذہب کا تو نام نہیں، ادھر پوری توجہ کر رہا ہوں، رمضان میں یہاں بڑی رونق ہوتی ہے، محرم سونا گذرتا ہے، اور بہت سے بدعات محفوظ ہے،

والسلام

سید سلیمان، ۲۴ر جولائی ۱۹۴۶ء

(۱۷)

عزیز مکرم السلام علیکم

بے شبہ بہار کے سنگین واقعات کے بعد آپ کے شذرات کا وزن ہلکا پڑ جاتا ہے، بہرحال قلم میں سختی نہ آنی چاہیے،

میں تو دہلی و سہارنپور بخیریت گیا اور مع اہل عیال واپس آیا، بشیر صاحب سے ملاقات دہلی میں ہوئی تھی، آپ لوگوں کا فسخ ارادہ احتیاط کا تقاضا تھا، مگر واقعات دور سے زیادہ معلوم ہوتے ہیں،

ہائے اویس[1] صاحب کا صدمہ ایسے ہی دل کو ہے، جیسے کسی عزیز قریب کا ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں،

مولانا عبد الباری صاحب کا مضمون "حکیم الامۃ اور سیاسیات حاضرہ" جب ماجد صاحب دیکھ چکے ہیں، تو ٹھیک ہی ہوگا، میرے پاس نہ بھیجیں،

رفقا اور حکیم صاحب، نیاز صاحب، بشیر صاحب کو سلام کہدیں،

والسلام

سید سلیمان، ۲۹ر نومبر ۱۹۴۶ء

[1] دار المصنفین کے ہیڈ کلرک تھے، اور اتنے قدیم تھے کہ گویا اس کے بانیوں میں تھے،

(۱۸)

بھوپال

برادر عزیز شاہ معین الدین صاحب شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آپ کا کارڈ ملا، آپ کی صحت کاملہ کے لیے دعا ہے، خیریت سے مطلع کرتے رہیے، رشید صدیقی صاحب کا خط آیا ہے، امید ہے کہ ایم اے کا پرچہ آپ نے بھیجدیا ہوگا،

افغانستان والے مضمون کا ترجمہ کرا کے آپ نے بھیجا اچھا کیا، کوئی رسید آئی ہو تو مطلع کیجئے گا، شذرات میں سیاسیات پر اگر لکھیں تو بہت محتاط لکھیے گا، کیونکہ ان سب کی نسبت میری طرف ہوگی،

ایک کتاب جاتی ہے، اس پر حوصلہ افزا ریویو کر دیجئے،

یہاں بحمد اللہ خیریت اور امن ہے، پھر بھی انتظامات سے غفلت نہیں کی جارہی ہے، جامعہ کی جوبلی میں شرکت کا ارادہ نہ تھا، مگر بعض وجوہ سے ارادہ کر لیا ہے، امید ہے کہ ۵ر کی صبح کو پہنچوں، آپ آئے تو ملاقات ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

سراج احمد مرحوم کی وفات پر افسوس ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائیں،

نیاز صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب اور رفقاء کو سلام کہدیجئے۔

معلوم نہیں صباح الدین صاحب کہاں ہیں۔ والسلام

سید سلیمان ۰ر نومبر ۱۹۴۶ء

(۱۹)

بھوپال

برادر عزیز دفعکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، لفافہ ملا، حالات معلوم ہوئے، میں نے بھی ایک لفافہ لکھا تھا، جس میں چند خطوط اور بھی تھے معلوم نہیں وہ ملا یا نہیں، مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ

اس فتنہ میں آپ کا دامن پاک تھا، اور رہا، مجھے آپ سے یہی امید تھی، اور دعا ہے کہ میری توقعات اسی طرح آپ سے پوری ہوتی رہیں،

آپ شاید وطن جانا چاہتے ہیں، تو آپ جا سکتے ہیں، میرا ان دنوں آنا نہ ہوگا، اپنی خیریت اور کیفیت مرض سے لکھنؤ جاکر اپنے معالج کو دکھا کر مجھے ضرور مطلع کیجئے گا، ورنہ تعلق خاطر رہے گا، آپ کی صحت کاملہ کے لیے دلی دعا ہے،

بشیر صاحب کی خدمت میں ان تقریبوں کے موقع پر میری طرف سے بعد سلام مبارکباد پہنچا دیجئے،

کتبخانہ اور رفقاء کی نگرانی کے لیے پہلے لفافہ میں لکھ چکا ہوں،

والسلام

سید سلیمان ۰ ۳۰ر دسمبر ۱۹۴۶ء

(۲۰)

بھوپال

برادر عزیز شفاکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، خط ملا، اللہ تعالیٰ آپ کو جلد شفا بخشیں، میرا ارادہ یہاں سے ۲۰ر کی شام کو روانگی کا ہے، ۲۱ر کی دوپہر کو وہاں پہنچوں گا، انشاء اللہ

۲۵ر کو اعظم گڈھ کا قصد ہے، خدا کرے کہ اس عرصہ میں آپ اچھے ہو جائیں،

خانصاحب[1] کو بھی اس پروگرام کی اطلاع دیدیجئے،

صباح الدین صاحب نے پٹنہ اسپتال میں گلے کا آپریشن کرایا ہے، اب غالباً اسپتال سے باہر آچکے ہوں،

والسلام، سید سلیمان ۰ ۱۲ر فروری ۱۹۴۷ء

[1] مکتوب الیہ اسی زمانہ میں بسلسلہ علاج دار العلوم ندوۃ العلماء میں مقیم تھا، خانصاحب سے مراد مولانا محمد عمران خانصاحب مہتمم دار العلوم ہیں،

ادبیات

تدریسی اشارے

از جناب سید اختر علی تلہری

ہر نفس تجھکو ہے اندیشۂ انجام ابھی
عقل پختہ سہی سودا ہے ترا خام ابھی

کیف امروز کا محرم ہو تو ناداں کیونکر
تو نے بدلے ہی نہیں ہیں سحر و شام ابھی

عشق کے بادۂ رنگیں میں ذرا اسکو ڈبو
دیکھ سادہ ہے ترا جامۂ احرام ابھی

یوں شب و روز نہ تو دہر کے شکوے کرتا
تو نے فطرت کا سنا ہی نہیں پیغام ابھی

مصحفِ حال کے اک لفظ کی تفسیر نہ کی
زندگی تیری ہے بے معنی و ناکام ابھی

سطوتِ عزم سے پھر چھا گئے آفاق پہ وہ
جن کو تو کہتا تھا خورشیدِ لبِ بام ابھی

قافلے والے کہیں سے ہیں کہیں جا پہنچے
بدنصیبی سے ہے تو مائلِ آرام ابھی

محفلِ عیش میں باتوں کے بنانے والے
امتحاں کا ترے آنے کو ہے ہنگام ابھی

اپنی بے بال و پری کا تو مداوا کرلے
مضطرب تو ہے عبث مرغِ تہ دام ابھی

تجھ سے کیا سلجھے گا الجھا ہوا دنیا کا نظام
تو ہے وابستۂ گیسوئے دلآرام ابھی

حوصلوں میں ترے رفعت ہو کہاں سے پیدا
شوق ہے خام تو ہے ذوق ترا عام ابھی

طورِ عرفانِ حقیقت پہ تو پہنچے کیونکر
کعبۂ دل میں بھرے ہیں ترے اصنام ابھی

ساقی بزم کے بدلے ہوئے تیور پہ نہ جا
شوق صادق ہو تو ملتا ہے تجھے جام ابھی

تو ہو اور شانہ کشِ زلفِ حقیقت اختر
تجھ سے چھوٹا نہیں سررشتۂ اوہام ابھی

مطبوعات جدیدہ

تدوین حدیث ۔ از مولانا سید مناظر احسن گیلانی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ: ادارہ مجلس علمی، حیری آباد ریڈر ناد کراچی۔

انکارِ حدیث کے فتنہ کے جواب میں بکثرت مضامین اور مستقل کتابیں بھی لکھی گئیں، مگر وہ عموماً مناظرانہ طرز کی ہیں، کوئی ایسی جامع کتاب نہیں تھی جس میں مناظرانہ اعتراض و جواب کے بجائے تدوین حدیث کی تاریخ کو ایسے علمی اور محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہو جس سے منکرین حدیث کا جواب اور احادیث سے متعلق شکوک و شبہات کا ازالہ بھی ہو جائے، اور پڑھنے والے کو محض خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں، بلکہ علمی اور عقلی حیثیت سے احادیث کی دینی اہمیت اور اس کی صحت کا پورا اذعان و یقین ہو جائے زیر نظر کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، جن لوگوں کو مصنف مرحوم کے طرز تحریر سے واقفیت ہے، ان کو اس کا اندازہ ہوگا کہ ان کا ذہن اتنا نکتہ آفریں اور قلم اتنا مواج تھا کہ جس موضوع پر بھی لکھتے تھے، اس کے ہر ہر پہلو پر معلومات کا اتنا انبار لگا دیتے تھے اور اپنی ذہانت سے بحث و نظر کے ایسے ایسے گوشے پیدا کرتے تھے جن کی جانب عام طور سے ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات بخاری کے ابواب کی طرح ان مباحث کا تعلق موضوع سے اس قدر دقیق ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں ربط پیدا کرنا دشوار ہو جاتا ہے، یہ خصوصیات اس کتاب میں بھی ہیں، اور اس میں بڑی بسط و شرح کے ساتھ احادیث نبوی کی دینی اہمیت، اس کی صحت اور اس کی تدوین کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے، اور اس کی صحت و استناد کے

مذہبی، علمی، تاریخی اور عقلی جس قدر پہلو اور دلائل بھی ہو سکتے ہیں سب پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، جس سے یہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ نہ صرف عقیدہ اور مذہبی نقطۂ نظر بلکہ خالص علمی و عقلی حیثیت سے بھی احادیث نبویؐ دنیا کا مستند ترین اخباری ذخیرہ ہے، اور صحت و استناد میں کوئی تاریخ بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، مصنف علام نے اپنے مدعا کے ثبوت کے لیے جو گوناگوں اور شاخ در شاخ مباحث پیدا کیے ہیں، ان کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اور جو بحثیں بظاہر موضوع سے غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہیں اور ان سے احادیث نبویؐ کے متعلق نہایت مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، اردو میں تدوین حدیث کے موضوع پر یہ پہلی جامع کتاب ہے، اگر اس میں احادیث کے رد و قبول کے اصول و شرائط اور فن جرح و تعدیل پر بحث ہوتی تو یہ کتاب اور زیادہ جامع اور مفید ہو جاتی،

نعمت کبریٰ ۔ مولفہ جناب مولانا سید شاہ عون احمد صاحب پھلواروی تقطیع اوسط، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ: دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، ضلع پٹنہ

انبیاے کرام علیہم السلام خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا مسئلہ اہل سنت کا متفقہ عقیدہ ہے، یعنی اس عالم آب و گل سے پردہ فرمانے کے بعد حضور انورؐ اسی طرح قبر انور میں جسمانی حیات کے ساتھ تشریف فرما ہیں، جس طرح پہلے اس دنیا میں تھے، اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی، یہ کتاب لکھکر مصنف نے یہ کمی پوری کی ہے، اس میں انھوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر قرآن مجید، تفاسیر و احادیث نبوی اور ائمۂ سلف کے اقوال سے حیات النبی کے دلائل جمع کر دیے ہیں، اور جن بعض آیات و احادیث سے بظاہر اس کے متعلق شکوک پیدا ہوتے ہیں، محدثین و مفسرین ہی کے اقوال سے ان کا ازالہ کیا ہے، اس میں ضمناً عام

انبیاء علیہم السلام اور شہداے کرام کی موت و حیات کا مسئلہ، ان کی موت کی نوعیت اور اس سے مراد عام حیات بعد الموت اور انبیاء کی حیات بعد الموت میں فرق، حیات جسمانی و حیات روحانی و عالم برزخ وغیرہ کے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، جس سے اس مسئلہ میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں رہتی، جن لوگوں کو اس سے دلچسپی ہو، ان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے،

لغات القرآن ۔ مؤلفہ مولانا شہید الدین صاحب مرحوم تقطیع اوسط، ضخامت ۴۴۱ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد للعہ پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ، کراچی،

لغات قرآنی پر اردو میں کئی کتابیں ہیں، مولانا زین العابدین سجاد میرٹھی نے قاموس القرآن کے نام سے ایک مختصر لغت لکھی ہے، جو مکتبہ علمیہ میرٹھ سے شائع ہوئی ہے، مولانا عبد الرشید نعمانی نے لغات القرآن کے نام سے ایک مبسوط لغت مرتب کی ہے، جو چار جلدوں میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہے، اب نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے یہ نئی لغت شائع کی ہے، اس میں حروف تہجی کی ترتیب سے قرآنی لغات کے معنی اردو میں لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی تشریح بھی کی گئی ہے، مگر یہ اسقدر مختصر ہے کہ صرف طلبہ کے کام کی ہے،

خاصان خدا کی نماز ۔ مرتبہ جناب مولانا ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ ار پتہ مکتبہ تحفظ ملت، رام نگر بنارس

نماز کی تکمیل کے لیے جس طرح ظاہری ارکان کی صحت شرط ہے، اسی طرح باطنی کیفیت یعنی خشوع و خضوع اور حضور قلب بھی ضروری ہے، اس کے بغیر نماز جسد بے روح رہتی ہے، چنانچہ صلحا و اخیار امت کی نمازیں باطنی کو لذت سے معمور رہتی تھیں، اس کتاب میں لائق مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام، تابعین عظام اور دوسرے صلحاء و

اختیار امت کی نمازوں کے باطنی کوائف مثلاً نماز کے لیے ان کا ذوق و شوق، جماعت کے اہتمام، خضوع و خشوع اور حضور قلب و استغراق وغیرہ کے واقعات کو موثر انداز میں نقل کیا ہے جس سے نماز کی اصل روح ظاہر ہو جاتی ہے،

تفسیر حقانی دو جزو تقطیع بڑی ضخامت بالترتیب ۸۰، ۱۱۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند

مولانا عبد الحق حقانی دہلوی کی تفسیر، اردو کی مشہور تفسیروں میں ہے، یہ عرصہ سے نایاب تھی، اس لئے کتب خانہ نعیمیہ دیوبند نے اس کو دوبارہ شایع کرنا شروع کیا ہے، فی الحال اس کے دو حصے شایع ہوئے ہیں، پہلا حصہ سورہ فاتحہ اور دوسرا پہلے پارہ کے ربع اول کی تفسیر پر مشتمل ہے، جن لوگون کو اردو تفسیر کے مطالعہ کا شوق ہو انکو اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے،

حقائق و معارف مرتبہ جناب منشی عبد الرحمن صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ ادارہ نشر المعارف چہلیک ملتان شہر

اب تک مصنف کی صرف نثری تصانیف نظر سے گذری تھیں، اب معلوم ہوا کہ وہ نظم کا بھی سنجیدہ ذوق رکھتے ہیں، چنانچہ انھون نے حقایق و معارف کے نام سے اردو کے منتخب اخلاقی حکیمانہ اور عارفانہ اشعار کا یہ مجموعہ مرتب کیا ہے، اس میں ۹۷ عنوانات کے ماتحت اس دور کے بہت سے شعراء کے حکیمانہ اور سبق آموز اشعار مرتب طریقہ سے جمع کئے گئے ہیں، اس انتخاب میں اشعار کے ظاہری محاسن کے بجائے ان کے معنوی حسن اور افادہ و سبق آموزی کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، تاہم اس کا بڑا حصہ ظاہری محاسن شاعری سے بھی آراستہ ہے، آجکل جبکہ شاعری کا ایک طوفان بپا ہے، اور آئے دن خرافات کے مجموعے نکلتے رہتے ہیں، یہ سنجیدہ اور مفید انتخاب قابل قدر ہے،

"م"

جلد ۷۹، ماہ شوال المکرم ۱۳۷۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۵۷ء نمبر ۵

فہرست مضامین